اسلام

دینِ فطرت

جامعہ تعلیمات اسلامی پوسٹ بکس: ۵۴۲۵
کراچی - پاکستان

اِسلام

دینِ فطرت

از

گروہِ دانشمندان

جامعہ تعلیمات اسلامی پوسٹ بکس : ۵۴۲۵
کراچی - پاکستان

مترجم ________________ محمد فضلِ حق

مدیر ________________ رضا حسین رضوانی

مصحح ________________ حامد ھاشمی

انتساب

اُن نوجوانوں کے نام

جو

دینِ اسلام سے شغف رکھتے ہیں اور اس کی معرفت چاہتے ہیں

اِسلام

" کیا تم نے پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بُنیاد حق و صداقت پر رکھّی گئی ہے۔ یہ علم کا ایک ایسا سرچشمہ ہے جس میں سے عقل و دانش کی متعدّد ندیاں پھُوٹتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس سے کئی چراغ روشن ہوں گے۔ یہ ایک بلند رہنما مینار ہے جو اللہ کی راہ کو روشن کرتا ہے۔ یہ اصولوں اور اعتقادات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو صداقت اور حقیقت کے ہر متلاشی کو اطمینان بخشتا ہے۔

اے لوگو! جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی برترین خوشنودی کی جانب ایک شاندار راستہ اور اپنی بندگی اور عبادت کا بلند ترین معیار قرار دیا ہے۔ اس نے اسے اعلیٰ احکام، بلند اصولوں، محکم دلائل، ناقابلِ تردید تفوّق اور مسلّمہ دانش سے نوازا ہے۔

اب یہ تمھارا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جو شان اور عظمت بخشی ہے اُسے قائم رکھو۔ اس پر خلوصِ دل سے عمل کرو۔ اس کے معتقدات سے انصاف کرو۔ اس کے احکام اور فرامین کی صحیح طور پر تعمیل کرو اور اپنی زندگیوں میں اسے اس کا مناسب مقام دو۔"

امامِ علی علیہ السلام

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید ابو القاسم موسوی خوئی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں قائم ہونے والا یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی دُنیا کے متعدد ممالک میں اسلامی عُلوم و معارف پر مشتمل معتبر اور مستند لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔

اِس ادارے کا مقصد دَورِ حاضر کی رُوحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو اصلی اور محکم اسلامی عُلوم کی طرف متوجّہ کرانا اور اس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیتِ رسول صؐ نے ایک مقدّس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اردو، انگریزی، فرانسیسی، سندھی اور گجراتی زبانوں میں ۸۰ سے زیادہ کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات، اُسلوبِ بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوسِ کتب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اِس کے علاوہ جامعہ کے زیرِ اہتمام چلنے والے ساٹھ سے زیادہ مدرسے گزشتہ سات برسوں سے قوم کے بچّے بچّیوں میں بُنیادی اسلامی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ امّید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ دینی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جا سکے۔

دُعا ہے کہ خداوندِ منّان ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے!

تعاون کا طلبگار

(شیخ) یوسف علی نفسی نجفی

وکیل حضرت آیت اللہ خوئی دام ظلہ العالی

قارئینِ گرامی!

یہ کتاب ادارۂ جامعہ تعلیماتِ اسلامی کی مطبوعات میں سے ہے۔ اِس ادارے کی مطبوعات کی تیاری کا مقصد دورِ حاضر کی رُوحانی ضروریات کا پورا کرنا اور بالخصوص اسلامی طرزِ فکر کو اُجاگر کرنا ہے۔ اِس ادارے نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ فقط وہی مواد پیش کیا جائے جو مستند ہو۔ اِس کتاب کی تیاری میں بھی یہی احتیاط برتی گئی ہے اور ایسی معلومات بھی شامل کی گئی ہیں جو بہت گرانقدر ہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ اِس کتاب کا مطالعہ اُسی نقطۂ نگاہ سے کریں جس کے تحت یہ لکھی گئی ہے۔ آپ سے یہ استدعا بھی ہے کہ ہماری مطبوعات پر اپنی بے لاگ آرا تحریر فرما کر بھیجیں جو بڑی خوشی سے اور شکریے کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ کو اِس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اِس ارشادِ ربّانی کی تعمیل ہو سکے۔

"(اے رسول!) کہہ دیجیے: میں تمھیں بس ایک ہی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اللہ کی خاطر اجتماعی یا انفرادی طور پر قیام کرو اور پھر غور کرو۔"

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔

تعاون کا طلبگار: سیکریٹری نشر و اشاعت

فہرست

پیش لفظ

اِس مختصر پیش لفظ میں ہم اپنے محترم قارئین کی توجّہ مندرجہ ذیل اہم نکات کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

ہم مسلمان ہیں لیکن کیا یہ جانے بغیر کہ اسلام ہر چیز سے بڑھ کر علم اور عمل کا نام ہے، فقط ہمارا مسلمان ہونا اور اس پر فخر و مباہات کرنا کافی ہے؟

اسلام بنی نوع انسان کی فکری اور اخلاقی اصلاح کے لیے دُنیا کے بارے میں ایک مخصوص تصوّر اور ایک ایسے انتہائی موزوں لائحۂ کار کے عِلم کا نام ہے جسے ایک حرکت پذیر مکتبِ فکر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

اسلام احکام و ضوابط کے ایک مجموعے اور اس سے وابستہ عملی ہدایات اور تعلیمات کے عِلم کا نام ہے۔

بد قسمتی سے بعض لوگ اپنے آپ کو محض اس لیے مسلمان خیال کرتے ہیں کہ وہ ایک مسلمان گھرانے یا ملک میں پیدا ہوئے یا اس لیے کہ انھیں سب سے پہلے اسلام ہی کا خیال آیا اور انھوں نے اسے قبول کر لیا۔

ظاہر ہے کہ ایک سچّا مسلمان اِن باتوں سے مطمئن نہیں ہو سکتا کیونکہ اسلام نہ تو والدین سے بطور وراثت حاصل کی جانے والی چیز ہے اور نہ ہی یہ

ماحول کی پیداوار ہے۔

ایک سچّے مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصول اور فروع سمیت اسلام کی تعلیمات کے بارے میں صحیح صحیح علم رکھتا ہو اور اس قابل ہو کہ وقت پڑنے پر مندرجہ ذیل دو سوالوں کا شافی جواب دے سکے خواہ وہ جواب کتنا ہی مختصر اور سادہ کیوں نہ ہو :۔

(۱) اسلام کیا ہے اور کس بنا پر یہ بنی نوع انسان کے لیے رحمت ہے ؟

(۲) تم نے اسلام کیوں قبول کیا ہے ؟

اسلام کے اصول اور تعلیمات سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد ان پر اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے۔

چونکہ اس کتاب کا مقصد اسلام کی بنیادی تعلیمات کو کسی حد تک جامع انداز میں پیش کرنا ہے لہٰذا قدرتی طور پر اس کا مجمل ہونا ضروری ہے۔

امرِ واقع یہ ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں اسلامی قوانین وضوابط پر لکھی گئی بہت سی کتابوں کی تلخیص سے استفادہ کیا گیا ہے چنانچہ کئی ایک مطالب جن کے بارے میں ضخیم کتابوں میں کئی ابواب تحریر کیے گئے ہیں، اس کتاب میں چند لفظوں یا چند سطروں میں بیان کر دیے گئے ہیں تاہم ایک واضح اسلوبِ تحریر اپنانے اور کتاب کی استدلالی رُوح برقرار رکھنے کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے۔

اس امر کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ اسلام کے قوانین اور اصول بیان کرتے ہوئے متعلّقہ اسناد کا حوالہ بالضرور دیا جائے اور دلیل مہیّا کیے بغیر کوئی بات نہ کہی جائے۔ جہاں تک فروعِ دین اور فقہی مسائل کا تعلّق ہے تو جس حد تک ممکن ہو سکا ہے اُن کے تعلیمی اور معاشرتی فلسفے کی جانب

توجّہ دلائی گئی ہے تاکہ ان پر بہتر بصیرت کے ساتھ عمل پیرا ہونے کے لیے قاری کی حوصلہ افزائی ہو۔

گو آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ کافی تعداد میں نقل کی گئی ہیں لیکن سادگی اور اختصار کے پیشِ نظر اُن کا عربی متن نہیں دیا گیا۔ یورپی دانشوروں کے اقوال صرف ابتدائی ابواب میں نقل کیے گئے ہیں۔

امّید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب ہماری صاف باطن نوجوان نسل کے اذہان کو جِلا بخشنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی اور اسلام کے وسیع پیمانے پر مطالعے کے لیے تمہید کا کام دے گی۔ یہ کتاب ہمارے نوجوانوں کو اس بات کی جانب راغب کرے گی کہ وہ اسلام کو ایک عظیم تخلیقی مکتبِ فکر کی حیثیت سے پہچانیں، اس سے بیش از بیش محبّت کریں اور اس کی خاطر ہر ممکن قربانیاں دیں۔ یہ کتاب نوجوان نسل کو ایک صحت مند اور ترقی پسند معاشرہ تشکیل دینے کی جانب راغب کرے گی۔

باب اوّل

مذہب اور انسانی زندگی

صفحہ نمبر

مذہب اور انسانی زندگی

مذہب بنی نوع انسان کی اہم ترین ضرورت ہے تاہم انسانی زندگی میں اس کا کردار متعیّن کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ آخر یہ چیز کیا ہے! مختصراً مذہب کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے :-

مذہب اللہ تعالیٰ پر ایمان کی روشنی میں ایک جامع تحریک اور ذہنی احساسِ ذمّے داری کا نام ہے جس کا مقصد خیالات اور عقائد کی اصلاح اعلیٰ اخلاقی اقدار کی تائید، معاشرے کے افراد کے مابین اچھے تعلّقات کا قیام اور ہر قسم کے ناجائز امتیازات کا خاتمہ ہے۔

اس تعریف کے مضمرات کو ذہن میں رکھتے ہوئے مذہب اور مذہبی تعلیمات کی اہمیّت اور ضرورت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس نکتے کی مزید تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ ہمیں مذہب کی ضرورت مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر ہے :-

مذہب اخلاقی اصولوں کا ضابطہ ہے

مذہب اخلاقی اصولوں مثلاً عدل، راستبازی، دیانت داری، اخوت

مساوات، پاک دامنی، رواداری، ایثار، خدمتِ خلق اور ایسی ہی دوسری انسانی خوبیوں کے لیے قاعدہ قانون مہیّا کرتا ہے۔ یہ ایسی خوبیاں ہیں جن کی عدم موجودگی میں صرف یہی نہیں کہ ہماری زندگی نظم و ضبط کھو بیٹھتی ہے بلکہ وہ ایک میدانِ کارزار میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ مذہب کے بغیر بھی ان اخلاقی اور معاشرتی خوبیوں کا حصول ممکن ہے تاہم یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ایک قوی مذہبی عقیدے کی عدم موجودگی میں یہ تصوّرات اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں اور محض ایسی سفارشات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جن پر عمل لازم و لابُد نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں یہ خصوصیات کسی دوست کے ایسے مشورے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں جسے قبول یا رد کرنا ہماری اپنی مرضی پر موقوف ہو۔

ان خوبیوں کی بنیاد درحقیقت ذہنی احساسات اور عقائد پر ہوتی ہے لہٰذا بدیہی طور پر یہ عام قوانین اور ضوابط کی دسترس سے باہر ہیں۔ یہ فقط ایک ازلی و ابدی اور قادرِ مطلق ہستی پر ایمان ہی ہے جو انسان میں ان خوبیوں کے حصول کا ذوق پیدا کرتا ہے اور اسے بلا تامّل راستبازی اور فرض کی ادائیگی کی جانب مائل کرتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اسے دوسروں کی خاطر قربانی دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ ازلی اور ابدی ہستی پروردگارِ عالم ہی کی ہے جو انسان کے ظاہر اور باطن سے واقف ہے اور اس پر پورا پورا اختیار رکھتی ہے اور جسے ہم اللہ تعالیٰ کہہ کر پکارتے ہیں۔

مشہور فلسفی اور مورّخ ول ڈیورنٹ (Will Durant) اپنی کتاب "لذائذِ فلسفہ" (Pleasures of Philosophy) میں لکھتا ہے کہ مذہب کی پشت پناہی کے بغیر اخلاق کی حیثیت محض زبانی جمع خرچ کی ہے کیونکہ

اس صورت میں ذمّے داری کا احساس ختم ہوجاتا ہے۔

مصائبِ زندگی برداشت کرنے کی قوّت

مذہب انسان کو مصائب برداشت کرنے کی ہمّت اور حوصلہ عطا کرتا ہے، مایوسی اور نا امّیدی کے نامرغوب ردِّ عمل کے مقابلے میں ایک فصیل کا کام دیتا ہے۔ ایک دین دار انسان جو اس ذاتِ الٰہی پر پُختہ ایمان رکھتا ہو جو لامحدود قوّت اور علم کا سرچشمہ ہے اور اسی کے کرم اور امداد پر بھروسا کرتا ہو وہ مصائب و آلام کے مقابلے میں کبھی ہمّت نہیں ہارتا کیونکہ اسے علم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی بزرگ و برتر ہستی کے سایۂ رحمت میں ہے جو دانا و بینا اور قادرِ مطلق ہے۔

اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہوئے کہ خداوندِ عالم کی ذاتِ اقدس کی مدد سے ہر مشکل حل ہو سکتی ہے اور ہر گُتھّی سلجھائی جا سکتی ہے، انسان ہر قسم کی بد دِلی اور مایوسی پر قابو پا سکتا ہے۔ اسی بِنا پر ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی حقیقی دین دار شخص شدید مایوسی کے ردِّ عمل کے طور پر خودکشی کرلے یا شکستگئ اعصاب اور نفسیاتی امراض کا شکار ہو جائے کیونکہ یہ کیفیّتیں نا امّیدی اور شکست خوردگی کی پیداوار ہوتی ہیں جو ایمان کی ضد ہیں۔

قُرآن مجید فرماتا ہے:

"بلاشبہ جو لوگ اللہ کے قریب ہیں ان کے لیے کوئی خوف و خطر نہیں اور وہ رنجیدہ نہیں ہوں گے"

پس مذہبی عقیدہ ایک قوّتِ محرّکہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا عامل بھی ہے جو انسان کو ہمّت اور حوصلے کے ساتھ مصائب برداشت

کرنے کے قابل بناتا ہے اور شکست خوردگی اور مایوسی کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔

برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) کہتا ہے کہ نازی نظامِ حکومت کے زوال کے بعد جرمنی میں ذہنی اور نظریاتی بغاوت کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا لیکن بلاشبہ اس ملک کے دوبارہ استحکام حاصل کرنے میں مذہب کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

ڈاکٹر ڈیورنٹ کے قول کے مطابق جس شخص کو مذہب پر ایمان نصیب نہ ہو اس کا طرزِ عمل ایک مخصوص نفسانی الجھاوے کا شکار ہو جاتا ہے اور جو زندگی عقیدے کے آسودگی بخش سہارے سے محروم ہو وہ ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہوتی ہے۔

نظریاتی خلا کا پُر کرنا

انسان زیادہ عرصے تک نظریاتی خلا کا متحمّل نہیں ہو سکتا اور اس صورت میں غلط نظریے اور باطل افکار کی جانب اس کا رجحان قطعی ہو جاتا ہے۔ چونکہ اُس کی روح کو صحیح عقائد اور معقول تعلیمات میسّر نہیں ہوتیں لہٰذا اوہام حتّیٰ کہ تباہ کُن خیالات اُس کے ذہن میں در آتے ہیں اور بعض اوقات ہمیشہ کے لیے اُس کے دماغ میں اپنے زہر آلود عناصر چھوڑ جاتے ہیں انسان کی بُت پرستی، آدم پرستی اور مختلف اوہام سے رغبت اور غیر ذی شعور اشیاء کے انسانی مقدّر پر اثرات کے اعتقاد کی شہادتیں ہمیں دُنیا کے بڑے بڑے روشن خیال اشخاص کے خیالات میں بھی ملتی ہیں۔ ان تمام اعتقادات کا ماخذ روحانی خلا ہے۔ یہ مذہب ہی ہے جو صحیح

تعلیمات کے ذریعے نظریاتی اور فکری خلا کو پُر کرکے انسان کو غیر منطقی اور مہمل اعتقادات سے نجات دلاتا ہے۔

پس مذہب کا صحیح اِدراک، اوہام اور فاسد خیالات سے نبرد آزما ہونے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے البتّہ اس میں بھی کلام نہیں کہ اگر مذہب کو صحیح طور پر نہ سمجھا جائے تو یہی خامی غلط اعتقادات کی ترویج میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

عِلم و دَانِش کی ترقّی میں اعانت

اپنی پائدار اور معقول تعلیمات کی بنا پر مذہب، سائنسی ترقّی کا ایک مؤثّر عامل ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد آزادئ فکر اور افعال کی شخصی ذمّے داری پر رکھی گئی ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے: "ہر شخص اپنے افعال کے لیے ذمّے دار ہے"۔

مذہبی اعتقاد کی رُو سے اِس کائنات کا ماخذ لامحدود عِلم ہے۔ یہ کائنات ایک ایسی ضخیم کتاب کی مانند ہے جسے ایک بے پایاں عِلم رکھنے والے عالِم کے قلم سے تحریر کیا گیا ہو۔ اس عظیم کتابِ تخلیق کا ہر صفحہ بلکہ ہر سطر اور ہر لفظ ایک کھُلی سچّائی کا حامل ہے اور عمیق مطالعے اور غور و فکر کا سزاوار ہے۔

جب ہم کائنات کو اِس زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ہمارے دل میں نظامِ تخلیق کے بارے میں مسلسل غور و فکر اور جستجو کا جذبہ اُبھرتا ہے جو سائنس اور انسانی عِلم و دانش کی ترقّی کا موجب بنتا ہے۔

اس کے برعکس اگر ہم یہ تصوّر کریں کہ یہ کائنات محض بے شعور

میکانکی عوامل کی پیداوار ہے اور یہ یقین نہ رکھتے ہوں کہ اس کا خالق کوئی ذی علم ہستی ہے تو پھر ہمارے لیے اِس کے رازہائے سربستہ کو دریافت کرنے کی کوششوں کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اصولی طور پر ایک ایسی کائنات جو ایک بے شعور مشینری کی کارکردگی کے نتیجے میں ظہور میں آئی ہو، نہ تو اُس کا ناک نقشہ درست ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ ایسے اسرار و رموز کی حامل ہو سکتی ہے جنھیں دریافت کرنے کی جستجو کی جائے۔

خالقِ کائنات کے بارے میں ایسا منفی انداز اختیار کرنے سے سائنس اور علمِ انسانی کی ترقّی کو جو دھچکا لگتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ یہ وہی حقیقت ہے جو موجودہ دَور کے عظیم فلسفی اور سائنس داں البرٹ آئن سٹائن (Albert Einstein) نے اپنے ایک مشہور خطبے میں بیان کی تھی جس میں اُس نے اِس امر کی وضاحت کی تھی کہ بڑے بڑے مفکّرین اور موجدین مذہب میں کیوں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُس کا کہنا ہے کہ عظیم مفکّرین میں شاذ ہی کوئی ایسا شخص ملے گا جو اپنی ایک مخصوص مذہبی حِس نہ رکھتا ہو اور یہ حِس ایک عام آدمی کے مذہب سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ حِس کائنات کے محیّر العقول طور پر صحیح صحیح نظام کے متعلق ایک مسرّت آمیز استعجاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور وقتاً فوقتاً ایسے راز افشا کرتی ہے جن کے بالمقابل تمام تر منظّم انسانی غور و فکر اور تحقیق و تدقیق ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ یہ حِس ایک سائنس داں کی زندگی اور سعی کی راہ روشن کرتی ہے اور جوں جوں وہ کامیابی اور منزلت سے ہم کنار ہوتا ہے یہ اسے خود غرضی اور تکبّر کے بوجھ سے آزاد رکھتی ہے۔

آگے چل کر وہ کہتا ہے: "یہ اپنے آپ پر عائد کردہ ایک اہم ذمّے داری،

نظامِ کائنات پر پختہ یقین اور ایک بہت بڑی مسحور کُن خواہش کا نتیجہ ہی تھا کہ جاہن کیپلر (Johann Kepler) اور نیوٹن (Newton) سالہا سال تک تنہائی میں بڑی خاموشی سے صعوبتیں برداشت کرتے رہے تاکہ کششِ ثقل اور اجرامِ فلکی کی حرکت کے قوانین کو سہل اور قابلِ فہم انداز میں پیش کر سکیں۔ بلاشبہ یہ مذہبی حس ہی تھی جس کی بدولت فدا کار اشخاص نے صدیوں اپنی مہم جاری رکھی اور ظاہری ناکامیوں کے باوجود بار بار اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے رہے اور جدّوجہد کرتے رہے۔"

عصرِ حاضر کا کیمیا داں ایبرنیتھی (Abernethy) کہتا ہے کہ اپنی تکمیل کے لیے سائنس کو چاہیئے کہ اللہ پر ایمان کو اپنا ایک مسلّمہ اصول سمجھے۔ پس ایک دین دار آدمی مذہب کی حق و صداقت پر مبنی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے دوسروں کے مقابلے میں بہتر طور پر تحقیق و تدقیق کا عمل سرانجام دے سکتا ہے اور فطرت کے اسرار اور قوانین کا انکشاف بخوبی کر سکتا ہے۔

امتیازات کے خلاف مبارزہ

مذہب کے نقطۂ نگاہ کے مطابق تمام انسان اللہ کے بندے اور ہر مُلک اللہ کی مِلکیّت ہے۔ اِس کے مطابق سبھی اللہ کی محبّت اور رحمت سے بہرہ ور ہیں لہٰذا ایک دوسرے کے برابر ہیں چنانچہ وہ رنگ، نسل اور طبقے پر مبنی تفریق کی پُرزور مخالفت کرتا ہے۔

اسلام بالخصوص یہ تعلیم دیتا ہے کہ کوئی انسان خون، نسل، زبان یا طبقے کی بِنا پر دوسرے سے برتر ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ یہ دین فقط روحانی برتری کا قائل ہے یعنی وہ برتری جس کی بنیاد پرہیزگاری اور تقویٰ

پر ہو۔ قرآن مجید فرماتا ہے :

"اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تمھاری قومیں اور قبیلے بنا دیے ہیں تاکہ تم ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ بلاشبہ تم میں سب سے زیادہ معزّزوہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

لہٰذا ایک ایسی دنیا میں جو طبقاتی تفریق کا سوال تو کجا ابھی تک رنگ کا مسئلہ بھی حل نہیں کر سکی، مذہب کا کردار بالکل واضح ہے۔

بہرحال اس امر سے بھی انکار کرنا ممکن نہیں کہ ہر مذہبی تصوّر اور عقیدہ مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ہر دوسری فکری تحریک کی مانند مذہب کو بھی صحیح رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اگر ایسی رہنمائی میسّر نہ ہو تو وہ اوہام پرستی، رہبانیت، عملی زندگی سے فرار اور نیم عرفانی نما منفی رجحانات کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کی مثالیں مغربی ممالک میں اب بھی بکثرت پائی جاتی ہیں جہاں لوگ اپنی مشینی زندگی سے اُکتا چکے ہیں۔ اِسی قسم کے ماحول میں صحیح عِلم کے فُقدان کے باعث مذہب کو کامیاب زندگی کے راستے میں ایک رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔

مذہبی حِس کے منابع

انسان مذہب سے اِتنی مدّتِ مدید سے آشنا رہا ہے کہ یہ دَور انسانی زندگی کی تحریر شُدہ تاریخ سے آگے بڑھ کر زمانہ قبل از تاریخ تک جا پہنچتا ہے۔

قُرآن مجید نے مذہب کو انسانی فطرت کا لازمہ اور اللہ تعالیٰ

کا مسلّمہ ضابطہ قرار دیا ہے : " اللہ کا مسلّمہ ضابطہ جس پر اس نے بنی نوع انسان کو استوار کیا ہے ۔"

مورّخین اور ماہرینِ عمرانیات کی تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ عبادت گاہیں سادہ یا مجہز شکل میں ہمیشہ انسانی زندگی کا ایک جزوِ لاینفک رہی ہیں اور مذہب کسی نہ کسی صورت میں انسان کی تاریخ سے وابستہ رہا ہے ۔

ڈاکٹر ڈیورنٹ بعض قوموں کے الحاد کے بارے میں قدرے طویل بحث کے بعد کہتا ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کے باوجود ایسے واقعات مستثنیات میں سے ہیں اور یہ قدیم نظریہ درست ہے کہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلّق بالعموم تمام انسانوں سے ہے ۔ ایک فلسفی کے نقطۂ نگاہ کے مطابق مذہب کا مسئلہ تاریخ اور نفسیات کے بنیادی مسائل میں سے ہے ۔

مزید برآں وہ کہتا ہے کہ عرصۂ بعید سے مذہب اور انسانی تاریخ کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے ۔ پارسائی کا تصوّر انسانی دماغ سے کبھی بھی محو نہیں کیا جا سکتا ۔

نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے انسان اور مذہب کا یہ قدیم رشتہ ثابت کرتا ہے کہ مذہبی حِس انسان کی بنیادی حِسیات میں سے ہے ۔

ایک فلسفی کا کہنا ہے کہ مذہبی حِس روحِ انسانی کے بنیادی اور فطری عناصر میں سے ایک عنصر ہے ۔

یہ امر بدیہی ہے کہ جب انسانی فکر کی سطح بلند نہیں تھی اور سائنس نے بھی کوئی معتدبہ ترقّی نہیں کی تھی یہ اندرونی حِس ناقابلِ یقین طور پر

اوہام سے خلط ملط تھی لیکن رفتہ رفتہ جب سائنس نے ترقّی کی اور انبیائے کرامؑ نے اپنی مسلسل تعلیمات اور اصلاحی کوششوں سے لوگوں کے خیالات کو سنوارا تو یہ حِس تمام کثافتوں سے پاک ہوکر دوبارہ پاکیزہ اور صاف ستھری ہوگئی اور اپنی اصلی حالت پر آگئی۔

قرن ہائے گزشتہ میں مذہب کی مخالف لہریں

موجودہ دَور میں یہ بات کچھ تعجّب انگیز معلوم ہوتی ہے کہ گزشتہ صدیوں میں اور بالخصوص سولھویں صدی عیسوی میں اور اس کے بعد مغربی ممالک میں مذہب کے خلاف بڑی تند و تیز لہریں ابھریں اور بہت سے آزاد خیال یورپینوں نے کلیسا سے اپنا ناطہ توڑ لیا۔ جو لوگ مذہب سے وفادار رہنا چاہتے تھے انھوں نے بعض مشرقی مذاہب میں پناہ لی یا مذہب و عرفان سے عاری مسلک اختیار کیا تاہم لوگوں کی ایک کثیر تعداد مادّیت وغیرہ کی جانب کِھنچتی چلی گئی۔

البتہ جب ہم اِس موضوع کے منابع پر ایک غائر اور تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں یورپ جن خاص حالات سے دوچار تھا ان کے ہوتے ہوئے اِس قسم کا ردِّ عمل کوئی غیر متوقّع بات بھی نہ تھی جن عوامل نے خلافِ مذہب تحریکوں کو جنم دیا اور یورپ کو مادّیت کی جانب رغبت دلائی انھیں ہم کلیسا کی اُن پالیسیوں کے پس منظر میں مشاہدہ کرسکتے ہیں جو اس نے نشاۃ ثانیہ اور مختلف میدانوں میں طبیعی علوم کی ترقّی کے بارے میں اختیار کیں۔

جب کلیسا نے ازمنۂ وسطیٰ میں اور بالخصوص تیرھویں صدی

سے پندرھویں صدی تک سائنس کے خلاف مہم شروع کی جو سولھویں اور سترھویں صدیوں میں بھی جاری رہی۔ عدالتی تحقیقات کے ذریعے سائنسی تحریکوں کا گلا گھونٹنا چاہا۔ پاپائے اعظم کے ایک فرمان کے ذریعے سائنس کی مذمّت کی۔ گلیلیو جیسے سائنس داں پر مقدمہ چلایا اور اسے زمین کی حرکت سے انکار کرنے پر مجبور کیا تو ایسے مذہب کی تعلیمات کے بارے میں سائنس دانوں کا جو ردِّ عمل ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے۔ اب جب کہ اُنھیں سائنس اور مذہب میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا تھا (یعنی وہ طرزِ فکر جسے اس زمانے کے ماحول کے مطابق مذہب کہا جاتا تھا) تو انھوں نے فطری طور پر سائنس کو ترجیح دی کیونکہ وہ خود اُس کی ٹھوس بنیادوں کا مشاہدہ اور تجربہ کر چکے تھے۔

مشابہت میں اشتباہ کی بنا پر اور دوسرے مذاہب اور ازمنۂ وسطیٰ کے کلیسا کے درمیان غلط طور پر مماثلت پیدا کرتے ہوئے بعض سائنس دانوں نے تمام مذاہب کے خلاف مہم شروع کر دی اور انھیں یکسر مسترد کر دیا۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ انھوں نے "مذہب اور سائنس کے مابین بے آہنگی" کا نظریہ بھی وضع کر لیا۔

اس کے برعکس اسلام میں سائنسی تحریک کی پہلی صدی ہجری میں ہی ابتدا ہو گئی اور اس کے ثمرات دوسری اور تیسری صدی ہجری میں حاصل ہوئے۔ اس تحریک کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلّق ہے سائنس کے بارے میں اُن کا رویّہ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کے رویّے سے یکسر مختلف تھا۔ اس تحریک نے جلد ہی مشہور عالمِ طبیعیات حسن ابن الہیثم اور کیمیا داں جابر بن حیّان جیسی شخصیتوں کو جنم

دیا جسے یورپین، علمِ کیمیا کا باوا آدم کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ متعدّد دوسرے سائنس داں بھی منصۂ شہود پر آئے۔ ان کی تصانیف نے جاہن کیپلر، روجر بیکن (Roger Bacon) اور لیونارڈو ڈا ونسی (Leonardo da Vinci) جیسے سائنس دانوں کے خیالات پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ یہ امر دلچسپی کا باعث ہے کہ یہ تمام سائنسی ترقی ازمنۂ وسطیٰ میں ظہور پذیر ہوئی اور یہ وہی دَور تھا جب کلیسا، نشاۃ ثانیہ اور نئی سائنسی تحریک کے خلاف نبرد آزمائی میں مصروف تھا۔

مشرق اور مغرب کے تمام مورّخین جنھوں نے اسلامی تہذیب سے بحث کی ہے اس بات پر متّفق ہیں کہ اس تہذیب نے ایک وسیع سائنسی تحریک کو جنم دیا جس نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ اور سائنسی تحریک پر دُور رس اثرات مرتب کیے۔

پس جن عوامل نے مغرب کے روشن خیال لوگوں کو مذہب سے قطع تعلّقی پر آمادہ کیا اُن کا وجود اسلام میں نہیں تھا۔ اس کے برعکس اس میں ایسے عوامل کارفرما تھے جن کا رُخ دوسری جانب تھا۔

المختصر اسلامی تحریک دُنیا کی سائنسی سرگرمیوں سے ایک مخصوص انداز میں وابستہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ یہ علم وفضل کی وسیع ترقّی کا ماخذ ثابت ہوئی تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے ایک طبقے کی باہمی چپقلش (جو پانچویں صدی ہجری میں اور اس کے بعد شدید تر ہوتی گئی)، کوتاہ نظری، اسلام کی صحیح تعلیمات سے بے توجّہی، ترقّی سے تغافل اور وقت کے تقاضوں سے بیگانگی ایسے عوامل تھے جس کے نتیجے میں بہت سے اسلامی ممالک ترقّی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے۔

ایک اور عامل جس نے مسئلے کو زیادہ اُلجھا دیا یہ تھا کہ نوجوان نسل کو صحیح اسلامی تعلیمات سے متعارف ہی نہیں کرایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف شعبوں میں اسلام کا تعمیری کردار ماند پڑ گیا۔ چنانچہ موجُودہ دَور میں صورتِ حال یہ ہے کہ نوجوانوں کے تصوّرات کے مطابق اسلام ہمیشہ خستہ اور افسُردہ حالت میں ہی رہا ہے تاہم یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر اسلامی تعلیمات کو ازسرِ نو رواج دیا جائے اور لوگوں کو بالخصوص نوجوان نسل کو اس سے صحیح طور پر روشناس کرایا جائے تو زمانۂ اولیٰ کی اسلامی تحریک کی روح پھر سے بیدار کی جاسکتی ہے۔

مذہب اور فلسفیانہ مکاتیبِ فکر

مادّہ پرستی خواہ سادہ شکل میں ہو یا منطقی مادّیت کے بھیس میں ہو جو کہ مارکس ازم اور کمیونزم کی بنیاد ہے تمام مذاہب کے نزدیک قابلِ نفرین ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادّہ پرستی کے نقطۂ نگاہ کے مطابق کائنات چند بے ارادہ اور بے مقصد حوادث کے مجموعے کے علاوہ کچھ نہیں

مذہب مادّہ پرستی کو ہدفِ ملامت بناتے ہوئے کئی ایک اصولوں پر بھروسا کرتا ہے جو عین منطق کے مطابق ہیں۔ اِس اجمال کی تفصیل ذیل میں درج ہے:۔

مادّہ پرست مکاتیبِ فکر نے نظامِ کائنات کی جو توجیہ پیش کی ہے وہ غیر سائنسی ہے کیونکہ علمی تحقیق کے دَوران سائنس ایسے نظاموں کے بارے میں گفتگو کرتی ہے جن کی صحت یقینی ہو اور انھیں حادثاتی واقعات پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

سائنس اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ اس کارخانۂ کائنات کا مُوجد عظیم ترین ماہرِ طبیعیات اور کیمیا داں، ماہرِ فن طبیب اور بہترین انسانیت داں اور عالمِ کائنات ہے کیونکہ اس عظیم کام کو سرانجام دیتے وقت اس نے تمام سائنسی قوانین کو مدّ نظر رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے ان قوانین کو مکمّل طور پر جانے بغیر ان کا نفاذ ممکن نہ تھا اور یہ بھی بِلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ قدرتی عوامل اور فطری ارتقا کے لیے اس قسم کے عِلم کا حامل ہونا ممکن نہیں۔

مادّہ پرستی نے نظریۂ جبر کو اپنے ایک بنیادی اصول کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ ہر انسانی حرکت اور فعل جبری عِلل کا ایک سلسلہ ہے لہٰذا مادّہ پرستانہ نقطۂ نگاہ کے مطابق تمام انسانی کاوشیں ایک مشین کے پہیّوں کی مانند ہیں۔ یہ امر بدیہی ہے کہ اس رائے کا قبول کرنا ہر معاشرتی، اخلاقی اور انسانی ذمّے داری کے نظریے سے متصادم ہے۔

اس کے برعکس مذہب پابندی اور ذمّے داری کا اصول قبول کرتا ہے اور یوں اپنی تعلیمات کی بنیاد انسانی رائے کی آزادی پر رکھتا ہے۔

یہ امر ناقابلِ تردید ہے کہ جبر کا اصول قبول کرنے سے اصولِ حرکت اور احساسِ ذمّے داری کو بڑا دھچکا لگتا ہے اور جُرم و زیادتی کی خواہش کو شہ ملتی ہے کیونکہ مجرم یہ عذر پیش کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے جرائم کے لیے جوابدہ نہیں اور انھوں نے جو کچھ کیا ہے اپنے ماحول سے اور جیسی تربیت انھیں مہیا کی گئی اُس سے مجبور ہو کر کیا ہے۔ اس کے برعکس اگر آزادئ فکر و عمل کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو دیدہ دلیری سے جرائم کا

مرتکب ہونے کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔

تمام تر انسانی معاملات پر مادّے کی بالادستی تسلیم کر کے اور محض مادّی اقدار کو قابلِ توجّہ سمجھ کر مادّہ پرستوں نے عملاً اخلاقی اقدار کو بالکل بے دخل کر دیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ تمام معاشرتی اور بین الاقوامی مفادات پر صرف اور صرف مادّی مفادات محیط ہیں۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ بدیہی ہے کیونکہ جب تک انسان دوستی، رواداری، ایثار، اخلاص اور محبّت کے اصولوں سے وابستگی اختیار نہ کی جائے عالمی سطح پر کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ فقط مادّے کی بالادستی ان اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

مذہبی اور شخصی آزادی

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مذہب شخصی آزادی کو محدود کر دیتا ہے اور کچھ خواہشات کی تکمیل میں سدِّ راہ ثابت ہوتا ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ مذہبی تعلیمات کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ معقول آزادی پر قدغن عائد کی جائے دراصل اس کا مقصد انسانی قوّتوں اور سرمائے کو ضیاع سے بچانا اور انھیں غلط اور بیکار کاموں میں صَرف ہونے سے روکنا ہے۔

مثلاً اگر مذہب نشہ آور اشیاء کے استعمال، قمار بازی اور ناجائز جنسی تعلّقات سے روکتا ہے تو اس کا مقصد فرد کے جسم اور روح کی حفاظت کرنا اور معاشرتی نظام کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ یہ اخلاقی نظم وضبط آزادی کی حقیقی روح سے قطعاً ہم آہنگ ہے کیونکہ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ انسان فرد اور معاشرے کے ارتقا کی خاطر اپنے سرمایۂ حیات سے کماحقّہٗ فائدہ

اٹھانے کے قابل ہو سکے۔ آزادی کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ خداداد قوتوں کو اللّوں تللّوں میں اُڑا دیا جائے اور غیر معتدل حرکتوں اور عیّاشیوں میں مشغول رہا جائے۔

مذہب ہر اُس آزادی کی حمایت کرتا ہے جو انسان کو مختلف شعبہ ہائے عمل میں پیش رفت کے قابل بناتی ہے۔ یہی حقیقی آزادی ہے اور باقی سب کچھ عیّاشی اور آوارگی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مذہب انسان کو مناسب لباس زیب تن کرنے، اچھّی غذا استعمال کرنے، صحت مندانہ تفریحات سے لطف اندوز ہونے اور تمام اچھّی چیزوں سے استفادہ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ مذہب انسان کو دنیا کی تمام آسائشوں سے متمتّع ہونے کی اجازت عطا کرتا ہے اور اُسے کسی مفید چیز کو ترک کرنے کے لیے نہیں کہتا۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

"کہہ دو: کون ہے جس نے ان خوبصورت چیزوں کی ممانعت کی ہو جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے بنائی ہیں اور خالص غذا کی؟"

علاوہ ازیں ہمارا مذہب ہمیں ہدایت کرتا ہے کہ وقت کے تقاضوں اور ضرورتوں کو کبھی فراموش نہ کریں اور اپنے آپ کو طب، ٹیکنالوجی اور صنعت کی تازہ ترین پیش رفت سے آگاہ رکھیں۔

پیشوائے اسلام ابو عبداللہ امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے: "جو شخص اپنے وقت اور اس کی ضروریات کو پہچانتا ہے وہ کبھی بھی بے خبری کے عالم میں زندگی کے تاریک حوادث کے چنگل میں نہیں پھنس سکتا۔"

ہمارا مذہب ہمیں اِس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ نئے خیالات اور رسوم و رواج میں سے جو مفید اور موزوں ہوں اُنھیں اپنا لیں اور جو نامناسب اور غلط ہوں اُنھیں مُسترد کردیں۔ ہمیں دوسروں کی اندھادھند تقلید نہیں کرنی چاہیئے اور نہ ہی کوئی ایسی چیز اختیار کرنی چاہیئے جو انسانی وقار اور آزادئ فکر کی روح کے منافی ہو۔

قُرآن مجید فرماتا ہے :-

"میرے اُن بندوں کو خوش خبری دو جو، جو کچھ کہا جائے اسے سُنتے ہیں اور جو بہترین ہو اسے اختیار کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت کی ہے اور جو عقلِ سلیم رکھتے ہیں۔"

باب دوم

اسلام کی حقیقی مشمولات

صفحہ نمبر

اِسلام کی حقیقی مشمولات

مندرجہ ذیل تین چیزیں اِسلامی عقائد کی بُنیاد ہیں :

(۱) —— اللہ پر ایمان

(۲) —— یومِ قیامت پر ایمان

(۳) —— انبیائے کرامؑ کی رسالت پر ایمان

اللہ پر ایمان

یہ بات زور دے کر کہی جا سکتی ہے کہ مفکّرین میں اس بارے میں کوئی اختلافِ رائے نہیں کہ کائنات کی ایک خود مختار علّتِ اولیٰ ہے جہاں تک مادّہ پرستوں کا تعلّق ہے وہ اسے مادّہ کہتے ہیں اور دینی فلاسفر اِسے ' اللہ ' کہتے ہیں۔ علّتِ اولیٰ کی ہستی کا اقرار ضروری ہے کیونکہ علل و معلول کا سلسلہ لامحدود طور پر جاری نہیں رہ سکتا اور ہمارے لیے ایک ایسی علّت تک پہنچنا ضروری ہے جو کسی دوسری علّت کی معلول نہ ہو یعنی جو آخری علّت یا وہ غیر متحرّک محرّک ہو۔ قائم بالذّات اور ازلی و ابدی ہو۔

یہ خود مختار علّتِ اولیٰ ہی ہے جو ہماری ذہنی زندگی کو ممکن ہی نہیں بلکہ بامعنی بھی بناتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے فرض کر لیجئے کہ ایسی کوئی علّتِ اولیٰ نہیں ہے۔ پھر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ علّت و معلول کا سلسلہ ہمیں اس جگہ لا کھڑا کرے گا جسے علمِ فلسفہ میں 'تسلسل' (Continuum ad Infinitum) کہتے ہیں۔ یوں ہماری جستجو ہمیں ایک اندھی گلی میں لے جائے گی اور یہ ایک لاحاصل کوشش کا آغاز ہوگا کیونکہ علّت کے بعد علّت اور معلول کے بعد معلول کے انبار لگتے جائیں گے اور کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم صفر کے بعد صفر لگاتے چلے جائیں اور نتیجہ صفر ہی رہے۔ یوں ایک مخصوص ذہنی عمل انسان کو دھوکا دیتا ہے اور راہِ راست سے بھٹکا دیتا ہے۔

پس واضح ہے کہ اس دلدل سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ ایک خود مختار علّتِ اولیٰ کی ہستی کو تسلیم کر لیا جائے۔

ایک ابدی اور اصل علّت کی موجودگی کا اقرار اللہ کے ماننے والوں اور مادّہ پرستوں کے مابین ایک مشترک عقیدہ ہے۔ جھگڑا محض اِس بات پر ہے کہ آیا علّتِ اولیٰ عِلم اور فہم و فراست سے بھی مُزیّن ہے یا نہیں۔ دراصل اختلافی نکتہ یہی ہے۔

مادّہ پرستوں کو اِس بات سے انکار ہے کہ علّتِ اولیٰ فہم و فراست کی حامل ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ علّتِ اولیٰ مادّہ ہے جو عقل و فہم سے عاری ہے۔ اس کے برعکس اللہ پر ایمان رکھنے والوں کا اصرار ہے کہ کائنات کی علّتِ اولیٰ لامحدُود علم اور فہم و فراست کی حامل ہے۔

اللہ کو شناخت کیسے کیا جائے؟

۱۔ کائنات : اب ہمیں کائنات کے مختلف مظاہر پر نظر ڈالنی چاہیئے تاکہ یہ پتا چل سکے کہ وہ ان دو نظریات میں سے کس کی تائید کرتے ہیں اور آیا موجوداتِ عالم اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ علّتِ اولیٰ فہم و فراست کی حامل ہے۔

بہتر ہوگا کہ ہم اپنی جستجو کی ابتدا خود اپنے بدن سے کریں۔ کیا انسانی آنکھ کی ساخت اور اس کے عدسوں، پردۂ بصارت اور دوسری تہوں کے جمانے کا انداز اس امر کی شہادت نہیں دیتا کہ اس کا بنانے والا انعکاسِ نُور اور عدسوں اور شیشوں کے عمل کے طبیعیاتی قوانین سے پوری طرح واقف ہے؟

انسانی خون حیاتیہ اور مختلف اقسام کے جسیموں سے مرکّب ہے جن کی مقدار مقرّر ہے۔ اگر اس مقرّرہ مقدار اور تناسب میں رتّی بھر تبدیلی آجائے تو سارا حیاتیاتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ کیا ان اجزا کی ترکیب یہ امر واضح نہیں کرتی کہ خون کا تخلیق کرنے والا اس کے تمام عناصر کی خاصیّتوں سے کما حقّہ، آگاہ ہے؟

کیا انسانی، حیوانی اور نباتی خلیوں کی پیچیدہ اور پُر اسرار اور ساتھ ہی ساتھ نفیس اور نپی تُلی ساخت اس حقیقت کی عکّاسی نہیں کرتی کہ یہ کام ایک ایسی ہستی نے انجام دیا ہے جو انسانوں، حیوانوں اور پودوں کی عضویات سے پوری طرح باخبر ہے؟

کیا نظامِ شمسی کی عجیب و غریب ساخت اور اس نظام کے ہر

سیّارے کی جسامت، فاصلے اور رفتار کے مابین مخصوص تناسب سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کارخانے کا خالق کششِ ثقل کے قانون اور مرکز گریز قوتوں پر محوری گردش کے اثرات سے پوری طرح واقف ہے؟

مختصراً کوچک ترین ذرّات سے لے کر بڑی سے بڑی کہکشاؤں تک کائنات میں جو کچھ موجود ہے اور وہ جس صحیح اور حیرت انگیز طور پر مرتّب انداز میں کام کر رہا ہے وہ اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ علّتِ اولیٰ ہر متعلقہ قانون اور نظام کا پورا پورا علم رکھتی ہے۔

اصولاً تمام انسانی علوم کائنات کے رموز اور قوانین کے ایک بہت ہی چھوٹے سے حصّے کے جزوی علم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ اشیاء کا جزوی علم رکھتے ہوئے ہم تو عالم اور سائنس داں بن جائیں اور وہ علّتِ اولیٰ جس نے تمام کائنات پیدا کی ہے، علم اور فہم وادراک سے عاری ہو؟

ڈاکٹر برنارڈ (Dr. Barnard) نے تبدیلیٔ قلب کا جو کارنامہ سرانجام دیا وہ طبابت اور جرّاحی کی ترقّی کے میدان میں لاکھوں سائنس دانوں کی ہزارہا سال کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ پھر یہ کیونکر باور کیا جاسکتا ہے کہ جس ہستی نے دل کی تخلیق کی وہی اس کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتی لہٰذا یہ کہنا کہ یہ صحیح طور پر ترتیب دیے گئے نظام محض اتّفاقی امور اور بے بنیاد اور بے مقصد اسباب کا نتیجہ ہیں اتنا ہی غیر منطقی ہے جتنا یہ کہنا کہ ڈاکٹر برنارڈ اور اس کے ساتھیوں نے تبدیلیٔ قلب کا جو معرکہ سر کیا وہ علم اور تحقیق کا نتیجہ نہ تھا بلکہ محض ایک اتفاقی چیز تھی۔

اس نوع کی تعبیر قطعاً ناقابلِ قبول ہے اور یہ کہنا کہ تمام تر کائنات

محض اتفاق سے معرضِ وجود میں آگئی ہے اس سے بھی زیادہ غیر منطقی بات ہے۔ لہٰذا کائنات کی ابتدا اور اس کے مشمولات کے بارے میں مادّی تعبیر قطعاً غیر سائنسی ہے۔

پس طبعی علوم مثلاً طبیعیات، کیمیا، عِلم الابدان، علمِ عضویات، طب اور فنِ جرّاحی کی ہر کتاب کو طبعی دینیات کی کتاب کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہ تمام کتابیں تخلیق کے حیرت انگیز نظاموں کے قوانین اور رموز سے بحث کرتی ہیں جن کی منطقی اور صحیح تعبیر اللہ کی ہستی پر ایمان لائے بغیر ممکن نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے میں دلائل دیتے ہوئے قرآن مجید نے یہی طرزِ استدلال اختیار کی ہے۔ جیسا کہ معروف سائنس داں اور جدید فلکیات کے بانی کیپلر نے کہا ہے: "ہم اجرامِ فلکی کی تخلیق اور شان و شکوہ کے بارے میں جتنا زیادہ علم حاصل کریں ہمارے اعتقاد میں اُتنی ہی زیادہ پختگی آنی چاہیے۔"

علوم کی پیش رفت اور اللہ تعالیٰ پر ایمان کی پختگی میں بڑا گہرا تعلّق ہے۔ جوں جوں سائنسی عِلم ترقی کرتا جائے گا عِلم اور قوّت کے واحد ماخذ پر انسان کا ایمان مستحکم ہوتا جائے گا۔

ایک ماہرِ حیاتیات البرٹ ونچسٹر (Albert Winchester) جو فلوریڈا کی اکیڈمی آف سائنسز کے سربراہ رہے ہیں کہتے ہیں کہ دُنیائے سائنس کی ہر نئی دریافت ہمارے ایمان کو سینکڑوں گُنا مضبُوط کرتی ہے۔ وہ ہمارے سینوں میں پوشیدہ شکوک کو رفع کرتی ہے اور اُن کی بجائے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور یکتائی کے گراں قدر خیالات کو متمکّن کرتی ہے۔

ب : حرکت، ارتقا اور زندگی :- علمِ طبیعیات ہمیں بتاتا ہے کہ اگر کوئی بے جان مادّہ ساکن ہو تو جب تک کوئی خارجی قوّت اسے حرکت میں نہ لائے وہ ساکن ہی رہتا ہے اور اگر وہ مادّہ حرکت کر رہا ہو تو جب تک کوئی بیرونی عامل اسے روک نہ دے وہ متحرّک ہی رہتا ہے۔ ایک اور سائنسی قانون ہمیں بتاتا ہے کہ جس مادّے پر کائنات مشتمل ہے اس کی یہ خاصیّت ہے کہ وہ مرورِ زمانہ کے ساتھ انتشار پذیر ہو کر زیادہ سادہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مشین صفت مادّہ مفرد مادّے میں ڈھل جاتا ہے۔ ذرّات اگر اپنی حالت پر قائم رہیں تو خود بخود ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور روشن ستارے اپنی چمک دمک کھو بیٹھتے ہیں۔

پس بے جان مادّے میں ایسا کوئی عامل نہیں ہے جو اُسے ارتقا کے راستے پر گامزن کر سکے۔ اس کے برعکس اس کا رجحان خود بخود منتشر ہونے کی جانب ہوتا ہے۔ ان حالات میں یہ ماننا پڑتا ہے کہ ارتقا اور زندگی باہر سے وارد ہوئی ہیں کیونکہ مادّے میں ایسا کوئی رجحان نہیں۔

ایک فلسفی کا کہنا ہے کہ دُنیا کو ایک ربّانی پوشاک میں دیکھے بغیر آپ زندگی کے اس میلان کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے جو سادہ امیبا (Ameoba) سے بنی نوع انسان (مثلاً آئن سٹائن (Einstein)، ایڈیسن (Edison) اور اناطول فرانس (Anatole France)) تک میں سرایت کئے ہوئے ہے یا یوں کہیئے کہ اللہ پر ایمان لائے بغیر زندگی کی جانب میلان اور ارتقا کی خواہش کی تعبیر ناممکن ہے۔

ج: کائنات کا تغیّر و تبدّل: سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ حرارتی حرکیات (Thermodynamics) کے دوسرے قانون کے مطابق دُنیا میں موجود تمام تر قوّت یکسانیت اور بے عملی کی جانب رواں دواں ہے اور ایک دن ایسا بھی آئے گا جب یہ یکساں ہوجانے کی بنا پر بے اثر ہوجائے گی۔ اس مرحلے پر ساری دُنیا پر لاتعلّقی کی کیفیّت طاری ہوگی۔ اس کی مثال چند باہم دِگر مربوط برتنوں کی ہے جن میں کوئی سیّال مادّہ ڈالا گیا ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مادہ ایک برتن سے دوسرے برتن کی جانب حرکت کرتا ہے لیکن یہ صُورت ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ جلد یا بدیر تمام برتنوں میں اس مادّے کی سطح ہموار ہوجاتی ہے اور پھر ہر چیز ساکن ہوجاتی ہے۔

اس قانون کے مطابق کائنات کی بھی لازماً ایک تاریخ ہے اور یہ ازلی و ابدی نہیں ہے۔ اگر یہ ازل سے موجود ہوتی تو کب کی ساکن اور بے اثر ہوچکی ہوتی۔

اس بنا پر ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ مادّی دُنیا ہمیشہ سے موجود نہیں۔ یہ دائمی چیز نہیں اور اس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔

اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کائنات کا ماخذ کیا ہے؟ کون سا ایسا واقعہ پیش آیا جس نے روزِ ازل کے سکون کو درہم برہم کردیا اور جو اِن تمام مظاہر کی پیدائش کا سبب بنا۔ کیا یہ پہلا دھماکا یا بہت بڑی ضرب کی آواز تھی؟ اگر ایسا ہی ہے تو ابتدائی مادّے کے یکساں ذرّات کے دھماکے کا ماخذ کیا تھا؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ مکمّل سکون اور بے تاثیری کے عالم

میں خود بخود ایک اتنا بڑا دھماکا ہو جائے؟

یہاں یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس بے عملی کو درہم وبرہم کرنے، بے جان مادّے کی یکسانیت میں ایک تموّج پیدا کرنے اور پھر دُنیا کے مختلف مظاہر کو وجود میں لانے میں ایک بیرونی عامل کارفرما تھا۔ ہم اس مافوقِ طبیعت عامل کو اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی کو ثابت کرنے کے مندرجہ بالا تین طریقے علمائے دینیات کی تصنیف کردہ مفصّل کتابوں کا موضوع ہیں۔ ہم نے یہاں محض ایک اجمالی خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

قرآن مجید اور اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار

یہ امر دلچسپی کا موجب ہے کہ ہماری مقدّس کتاب یعنی قُرآن مجید میں جس کی بہت سی آیات کا مطمحِ نظر انسان کے ایمان کو اللہ پر محکم تر بنانا ہے، بلا استثنا، سائنسی دلائل پیش کرنے پر انحصار کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سے متعلّق بیشتر آیات میں قرآن مجید پہلے طریقِ استدلال یعنی نظامِ کائنات کے مطالعے کی جانب توجّہ دلاتا ہے۔ وہ بنی نوع انسان سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس عجیب و غریب نظام کے بارے میں غور و فکر کریں۔ بعض اوقات وہ تخلیقِ ارض وسماوات کی جانب اشارہ کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ: "آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور شب و روز کے اُلٹ پھیر میں عقل مند لوگوں

کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں"۔

بعض اوقات قرآن مجید دوسرے طریقہ ہائے استدلال اختیار کرتا ہے۔ وہ قہرمانِ توحید حضرت ابراہیمؑ کے الفاظ یوں نقل کرتا ہے :-

" میرا پروردگار وہی ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے"۔

یہاں زندگی اور موت کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں قطعی طور پر خالق کی ہستی کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ جیساکہ اوپر بیان ہوا یہ اللہ تعالیٰ کی ہستی ثابت کرنے کا دوسرا طریقہ ہے۔ قرآن مجید میں توحیدِ الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی ہستی کے اقرار کے بارے میں سینکڑوں آیات ہیں جن میں عجائباتِ تخلیق اور کائنات کے شان وشکوہ کی جانب توجّہ مبذول کرائی گئی ہے۔ ان آیات کا مطالعہ ایک علیٰحدہ کتاب کا متقاضی ہے جس میں سائنس کے کارناموں اور اسرارِ قرآنی کو پہلو بہ پہلو رکھ کر بحث کی جاسکتی ہے۔

دہریت کا کوئی وجود نہیں

اللہ تعالیٰ کی ہستی کے اثبات کے بارے میں جو سائنسی دلائل اوپر پیش کیے گئے ہیں اُن کی روشنی میں یہ دریافت کیا جاسکتا ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ بیشتر سائنس داں اور طبعی علوم کے بانی ابھی تک دہریت کے دامن سے وابستہ ہیں۔ اس سوال کا جواب بالکل آسان ہے۔ کوئی ایسا سائنس داں مشکل سے ہی ملے گا جو کھلّم کھُلّا یا دل ہی دل میں علّتِ اولیٰ یا مبدائے علم وقدرت کے وجود کا اقرار نہ کرتا ہو اور اس چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آیا وہ اللہ یا گاڈ (God)

کے الفاظ استعمال کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ ایک معروف فلسفی کے الفاظ کے مطابق دہریت کا کوئی وجود نہیں۔ ہر شخص اپنے انداز میں اُسی ذاتِ اقدس کے بارے میں سوچتا ہے اور اس کی ہستی کا اقرار کرتا ہے۔

اگر کوئی شخص دل کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یہ کہے کہ فطرت نے دل کے دائیں اور بائیں خانوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی ہے تاکہ صاف اور ناصاف خون ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائیں تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ فطرت مقصد، ارادہ، لائحۂ عمل اور قوّتِ ادراک رکھتی ہے؟ اس صورت میں کیا یہ سمجھنا ممکن ہے کہ فطرت سے اس کی مراد ایسے عوامل ہیں جو فہم و ادراک سے عاری ہوں؟ بدیہی طور پر اس شخص کی مراد اللہ تعالیٰ سے ہے گو وہ فطرت کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

اکثر سائنس دانوں نے اپنے مقالات میں اسی قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے اُن کے علّتِ اولیٰ کی ہستی پر ایمان کا ثبوت ملتا ہے۔ اِس سے اُن کے اِس عقیدے کا اظہار ہوتا ہے کہ فطرت مقصد، عزم، منشا اور لائحۂ عمل رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ لفظ "فطرت" سے اُن کی مراد عزم و ادراک سے عاری عوامل نہیں۔ دراصل وہ اِس لفظ کو اللہ ہی کے ایک نام کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اللہ کی صفات

یہ امر تعجّب انگیز نہیں کہ گو اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ثابت کرنا آسان ہے لیکن اس کی ہستی کی حقیقت اور اس کی صفات کا سمجھنا مُشکل ہے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ازلی و ابدی اور لامحدود ہے۔ وہ عِلم، قدرت، زمان اور مکان کے لحاظ سے غیر محدود ہے جب کہ ہمارا عِلم اور قدرت خواہ وہ کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں بہر حال محدود ہیں اور ان کی کوئی نہ کوئی انتہا ہے لہٰذا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک محدود ہستی ایک لامحدود ہستی کی تہہ تک پہنچ سکے۔ ایک ننھّے مُنّے چوزے کے لیے جس نے انڈے کے خول میں پرورش پائی ہو یہ جاننا کیونکر ممکن ہے کہ دُور اُفتادہ کہکشاؤں کی لامحدود خلاؤں میں کیا ہو رہا ہے؟

تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اپنی غور و فکر، عِلم و ادراک کی قوّتوں کی حد تک بھی اللہ تعالیٰ کی صفات کو سمجھنے کی صلاحیّت نہیں رکھتے۔

مظاہرِ کائنات کے مطالعے سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی مندرجہ ذیل صفات کا پتا چلتا ہے:۔

وہ علیم و خبیر ہے:

اس امر کی شہادت ہمیں زندگی کی غیر معمولی اور حیرت انگیز رنگا رنگی اور زمین اور آسمانوں میں جو کچھ موجود ہے اس سے ملتی ہے۔

وہ حیّ لَایموت ہے:

دراصل زندگی علم اور قدرت کے اتّحاد کا نام ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات عالِم کُل اور قادرِ مطلق ہے لہٰذا اُس کی زندگی بھی لازوال ہے۔ اسی بنا پر وہ منشاء اور ادراک کا مالک بھی ہے۔ وہ ہر چیز کو دیکھتا اور ہر آواز کو سُنتا ہے۔ وہ ہر جگہ حاضر ہے۔ وہ ازلی و

ابدی ہے۔ وہ ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

یہ چند ایسی صفات ہیں جنھیں صفاتِ ثبوتیہ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ مثبت کیفیات کی حامل ہیں۔ کچھ ایسی صفات بھی ہیں جو صفاتِ سلبیہ کہلاتی ہیں اور منفی کیفیات کی حامل ہیں۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر لحاظ سے لامحدود اور مکمّل ہے لہٰذا وہ جہل، مجبوری، احتیاج اور نقائص سے مبرّا ہے۔ اُس ذاتِ اقدس کا کوئی شریک یا ہمسر نہیں۔ دراصل ہر لحاظ سے دو لامحدود ہستیوں کا تصوّر ہی ناممکن ہے کیونکہ اس صورت میں اُن دونوں میں سے ہر ایک، دوسرے کی ماہیّت سے عاری ہوگا۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مادّی جسم سے مبرّا ہے۔ تمام اجسام کسی نہ کسی وقت ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور ایک ازلی و ابدی ہستی کسی ایسے جسم کی محتاج نہیں ہوسکتی جو ٹوٹ پھوٹ جائے، تحلیل ہوجائے یا اُس میں کوئی تبدیلی وقوع پذیر ہوسکتی ہو۔

توحیدِ الٰہی

توحیدِ الٰہی تمام دینی تعلیمات کی بُنیاد ہے۔ اسلامی عقائد میں اِسے اوّلیت کا درجہ حاصل ہے اور کسی نہ کسی شکل میں یہ تمام اسلامی احکام اور تعلیمات کا جزو ہے۔ اِسلام ہر قسم کی کثرت پرستی، ثنویت اور تثلیث کو مسترد کرتا ہے۔ اس کے مطابق اللہ واحد ہے۔ اُس کے اجزاء نہیں اور کوئی اُس کا مثل نہیں۔ اس منزل کو توحیدِ ذات کہا جاتا ہے۔

صفات میں توحید

کئی ایک صفات (مثلاً علم، قدرت، ابدیت وغیرہ) اللہ تعالیٰ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ یہ صفات اللہ کی ذات سے الگ نہیں بلکہ عین ذات ہیں۔ وہ ایک لامحدود ہستی ہے اور ایک لامحدود ہستی حقیقت کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ ان تمام صفات کا رُخ صرف ایک صفت کی جانب ہے اور وہ ہے لامحدودیت۔ اِس منزل کو 'صفات میں توحید' کہا جاتا ہے۔

عبادت میں توحید

اسلام کی تعلیمات کے مطابق صرف اللہ کی ذات ہی معبود ہے۔ اسلام کسی صورت میں بھی کسی دوسرے شخص یا چیز کی پرستش کی اجازت نہیں دیتا۔ سورج، ستارے یا انسان کوئی بھی پُوجنے کے لائق نہیں کیونکہ یہ سب چیزیں اُسی کی بنائی ہوئی ہیں اور وہ ان پر مکمّل قدرت اور اختیار رکھتا ہے۔ پس صرف ذاتِ خداوندی ہی پرستش کے قابل ہے۔ اس منزل کو 'عبادت میں توحید' کہا جاتا ہے۔

عمل میں توحید

جو واقعات دُنیا میں روزمرّہ پیش آتے ہیں اُن کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا خالق اور تمام تر قوّت کا اصلی سرچشمہ ہے۔ اگر ہم کوئی کام سرانجام دیں تو اس کے

لیے ضروری قوّت وہی مہیّا کرتا ہے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے تمام کام اُسی کی مدد سے انجام پاتے ہیں۔ کوئی شخص اس کی قوّت و قدرت سے بے نیاز ہو کر کوئی قوّت نہیں رکھتا۔ قطعی اور مستقل قوّت اُسی کا حصّہ ہے۔ اِسے عُمل میں وحدت' کہا جاتا ہے۔

تاہم اس سے یہ غلط معنیٰ اخذ نہیں کرنے چاہئیں کہ ہماری کوئی آزادانہ مرضی یا ذمّے داری ہی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود اُس نے ہمیں آزادی سے بہرہ ور فرمایا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم اپنی دُنیاوی اور اُخروی زندگی کی بہتری کے لیے آزادی سے مناسب راستہ اختیار کریں۔ اس نے ہم پر اپنا کرم فرمایا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے تمام اسباب ہمیں مہیّا کر دیے ہیں۔

یہ آزادی ہمارے لیے ذاتِ الٰہی کی جانب سے ایک تحفہ ہے اور چونکہ ہمیں آزادئ فکر و عمل عطا کی گئی ہے اسی بِنا پر ہمیں اپنے اعمال کے لیے بھی مسئول ٹھہرایا گیا ہے۔

انسان اور آزادئ ارادہ

مناسب ہوگا کہ آزادئ ارادہ کے مسئلے پر کچھ مزید بحث کی جائے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ جہاں تک ہمارے اعمال کا تعلّق ہے ہماری تقدیر کا فیصلہ پہلے سے ہی نہیں کر دیا گیا۔ ہمیں ارادے اور عمل کی آزادی حاصل ہے۔ انسان کے فکر و عمل میں آزاد ہونے کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ہم بدعنوانی کا مرتکب ہونے والوں کو ان کی بُرائیوں پر لعنت ملامت

کرتے ہیں۔ ہم زیادتی کرنے والوں کے خلاف عدالتوں میں مقدمے دائر کرتے ہیں اور اُن کے لیے سزا کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حتّٰی کہ وہ لوگ جو تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں عملی زندگی میں وہ بھی اس قسم کے سب ہی اقدام کرتے ہیں۔ اگر انسان کو ارادے کی کوئی آزادی حاصل نہیں اور اُس کے مقدّر کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی کر دیا ہے یا اگر انسان اپنی جسمانی اور روحانی تربیت اور ماحول کے آگے بے بس ہے تو پھر عدالتیں اور مقدمہ بازی بے معنیٰ چیزیں ہیں۔ نہ کوئی اچھّا اور محنتی کارکن کسی تعریف کا مستحق ہے اور نہ ہی کسی مجرم کے خلاف عدالتی کارروائی یا سزا کا کوئی جواز ہے کیونکہ دونوں اپنے اپنے اعمال کے بارے میں بے بس ہیں۔ کسی ایسے شخص پر مقدمہ چلانا جسے اپنے اعمال کے بارے میں کوئی اختیار نہ ہو، عدل کے تقاضوں پر بھی پورا نہیں اُترتا۔ معقول انسان روزمرّہ کی زندگی میں جس رویّے کا مظاہرہ کرتے ہیں اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ انسانی ضمیر اس امر کا معترف ہے کہ انسان کو آزادیٔ ارادہ حاصل ہے۔ پس تقدیر کے عقیدے کی کوئی معقول بنیاد نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں فکر و عمل کی آزادی عنایت کی ہے تاہم ہمارا فرض ہے کہ اس آزادی کے ناجائز استعمال سے اجتناب برتیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی خدا داد قوّتوں کو اپنی اور معاشرے کی بہتری اور خوشحالی کے حصول کی خاطر صَرف کریں۔

ہمیں اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ ہم غلط خیالات اور باطل نظریات کی پیروی کریں اور آزادیٔ فکر و عمل کی آڑ میں غلط کام کریں کیونکہ اس کا مطلب آزادی نہیں بلکہ فتنہ و فساد ہوگا۔

باب سوم

حیاتِ جاودانی کی جانب

صفحہ نمبر

حیاتِ جاودانی کی جانب

موت

موت کے معنیٰ روح کے بدن سے الگ ہو جانے کے ہیں۔ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ انسان موت کے نتیجے میں معدوم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ فقط ایک دُنیا سے دوسری دُنیا میں منتقل ہو جاتا ہے جہاں وہ ایک نئی زندگی کی ابتدا کرتا ہے۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے: "تم لوگ کالعدم ہونے کے لیے پیدا نہیں کیے گئے۔ تم ابدی زندگی کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔ بات صرف یہ ہے کہ تم ایک دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل کر دیے جاتے ہو"

اسلام کے مطابق تمام افراد کی ارواح کی اجسام سے جُدائی یکساں طور پر عمل میں نہیں آتی۔ گناہ گاروں اور ایسے لوگوں کی جان جو دنیاوی معاملات سے بہت زیادہ وابستگی رکھتے ہوں بڑی سختی سے نکلتی ہے جب کہ نیک لوگ اور اللہ سے محبّت رکھنے والے انسان جنھوں نے اپنی زندگی میں دوسری دُنیا سے رابطہ قائم رکھّا ہو بڑی آسانی سے جان جانِ آفرین کے سپرد کر دیتے ہیں۔

عُقبیٰ

انبیائے کرامؑ اور تمام مقدّس کتابوں کا اِس امر پر اتّفاق ہے کہ انسانی زندگی موت سے ختم نہیں ہوتی اور موجودہ دُنیا کے بعد ایک اور دُنیا بھی ہے جہاں انسان اپنے اچھّے یا بُرے اعمال کی جزا اور سزا پائیں گے۔ اس دُنیا میں راستباز لوگ خوشگوار اور مسرّت انگیز زندگی بسر کریں گے اور بدکردار لوگوں کو ان کے گناہوں کی پاداش میں عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ قیامت اور آخرت پر اعتقاد تمام مذاہب کے بنیادی اصولوں میں سے ہے اور جو شخص انبیائے کرامؑ کو مانتا ہو اسے قیامت پر بھی ایمان لانا پڑتا ہے۔

یہ نظریہ کہ موت کے ساتھ انسان کا سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اور وہ کالعدم ہو جاتا ہے فقط خوفناک ہی نہیں بلکہ انوکھا اور غیر منطقی بھی ہے۔ بالخصوص جب اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وحدانیت کا اقرار کر لیا جائے تو پھر یہ نظریہ کاملاً ناقابلِ فہم ہو جاتا ہے۔

یہ امر ناقابلِ یقین ہے کہ ارتقاء کے تمام پیچیدہ قوانین کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک سادہ اور بے مایہ ہستی کو ابنِ سینا اور آئن سٹائن جیسی ایک بے حد ترقّی یافتہ شخصیت میں بدل دیا جائے اور پھر اُسے مکمّل طور پر معدوم کر دیا جائے۔ عقلِ سلیم اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ پوری نسلِ انسانی اور اس کی تہذیب و تمدّن کے مقدّر میں معدوم ہونا لکھا ہے۔ اس قسم کا نظریہ ناقابلِ یقین اور غیر معقول ہونے کے ساتھ ساتھ خالق کے عِلم، عقل اور مہارت سے بھی ہم آہنگ نہیں۔

یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک شیخی باز شخص بڑی محنت اور احتیاط سے تیار کیے ہوئے ایک نقشے کے مطابق ایک شاندار ورکشاپ یا فیکٹری تعمیر کرے اور پھر اُسے ڈائنامائٹ سے اُڑا کر زمیں بوس کر دے۔

کیا یہ بات زیادہ قرینِ عقل نہیں ہوگی اگر ہم تسلیم کرلیں کہ زندگی موت کے بعد بھی جاری رہتی ہے اور ارتقا کا عمل ختم نہیں ہوجاتا۔ یہاں ایک بڑی عمدہ مثال دی جاسکتی ہے۔ اس دُنیا میں ہماری زندگی ایک جنین کی مانند ہے جو مختلف ارتقائی منازل سے گزر کر ایک زیادہ وسیع اور مکمّل حالت اختیار کرلیتا ہے جس کے بارے میں وہ پہلے سوچ بھی نہیں سکتا تھا (بشرطیکہ اس میں سوچنے کی صلاحیّت موجود ہوتی)۔

اگر انسانی زندگی جنین کے دَور تک ہی محدود ہوتی اور ہر جنین اپنی پیدائش کے فوراً بعد مر جاتا تو کیا ایسی زندگی غیر منطقی اور غیر معقول نہ ہوتی؟ یہ بات زیادہ قرینِ عقل ہوگی کہ انسانی زندگی اِس دُنیا میں مادّی، رُوحانی اور اخلاقی ارتقا کے پیچیدہ اور دشوار گزار راستے عبور کرنے کے بعد دوسری دُنیا میں ایک بلند تر اور وسیع تر زندگی کی ابتدا کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ اُس دُنیا کی زندگی کا موجودہ زندگی سے ایسا ہی رشتہ ہونا چاہیئے جیسا کہ اس دُنیا کی زندگی کا جنین کی زندگی سے ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ موت کے ساتھ انسان معدوم نہیں ہوجاتا بلکہ ایک

اور دُنیا میں منتقل ہو جاتا ہے ۔ اُس زندگی کی مکمّل تفصیلات اور خصوصیات ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں کیونکہ ہماری سمجھ بُوجھ اس دُنیا کی چار دیواری تک محدود ہے تاہم ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ موت سے ہماری زندگی ختم نہیں ہو جاتی اور ایک دوسری دُنیا کا وجود بھی ہے ۔

قوانینِ قدرت اور اُن قوّتوں کا مطالعہ جو انسان کو ارتقا کی راہ پر گامزن کرتی ہیں اور اُس دُنیا کی منظّم شان و شوکت کا نظارہ یقین کی حد تک اس حقیقت کا شاہد ہے ۔

قرآن مجید فرماتا ہے :

"کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمھیں بِلا مقصد پیدا کیا ہے اور تمھیں ہماری جانب لوٹ کر نہیں آنا ہے؟"

مزید ارشاد ہوتا ہے :

"بلاشُبہ تم پہلے ارتقا کے بارے میں جانتے ہو۔ پھر تم غور کیوں نہیں کرتے ؟"

اِس ارشادِ ربّانی سے مراد یہ ہے کہ جب تم اِس دُنیا کی زندگی کا مشاہدہ کر چکے ہو تو پھر تم یہ نتیجہ اخذ کیوں نہیں کرتے کہ ایک اور دنیا بھی ہے کیونکہ موجودہ دُنیا اور اس میں انسانی زندگی کے ارتقا کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ ایک اور دُنیا کا وجود بھی ہے جہاں ارتقا کا عمل جاری رہے گا ۔

سائنسی قوانین اور قیامت

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دورِ حاضر کے انکشافات کے ذریعے سائنس

نے قیامت اور حیات بعد از ممات کا امکان ثابت کرنے کی جانب ایک بڑا طویل قدم اٹھایا ہے اور مادّے اور قوّت کے فنا ناپذیر ہونے کے نظریے کے پیش کیے جانے کے بعد قیامت جو پہلے ناممکن خیال کی جاتی تھی اب ایک منطقی اور قابلِ فہم چیز ہو گئی ہے۔

مادّے کے فنا ناپذیر ہونے کے نظریے نے جس کا انکشاف سب سے پہلے لیووئے زیر (Lavoisier) نے کیا، مکمّل معدومیت کے سوال کو قطعی غیر سائنسی قرار دیا ہے۔ اس نظریے کے مطابق انسانی اجزا خواہ وہ تحلیل ہو کر منتشر ہی کیوں نہ ہو جائیں پھر بھی اسی دنیا میں رہتے ہیں اور یہ عین ممکن ہے کہ ایک دن انھیں دوبارہ جمع کر لیا جائے۔

یہ انسان کے حشر اور موت کے بعد زندگی جاری رکھنے کے اقدام کی جانب پہلا قدم ہے۔ مادام کیوری کے تابکار مادّے دریافت کرنے کے بعد اس نظریے کو اور زیادہ تقویت ملی۔ اِس کی دریافت نے اِس امر کی تصدیق کر دی کہ صرف مادّہ ہی نہیں بلکہ قوّت (Energy) بھی جاودانی چیز ہے اور چونکہ یہ ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتے ہیں اس لیے ان میں کوئی مغائرت نہیں ہے۔

اس بنا پر ہمیں تسلیم کر لینا چاہیئے کہ ہمارے خیالات، اعمال اور حرکات جو ہماری مختلف جسمانی قوّتوں کی قلبِ ماہیت سے ظہور پذیر ہوتی ہیں اس دُنیا میں باقی رہتی ہیں۔

ہماری صوتی لہریں معدوم نہیں ہوتیں اور ان کے آثار ہوا میں اور ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی اشیا میں موجود رہتے ہیں۔ فقط اُن کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ یہی حال ہمارے اعمال و افعال کا ہے۔ یہ قیامت

حتّٰی کہ خود اعمال کو جسمانی طور پر دیکھنے کے امکان کی جانب ایک اور قدم ہے۔

بہرحال سائنس کی ترقّی کے نتیجے میں قیامت کا مسئلہ اب اتنا پیچیدہ نہیں رہا جتنا پہلے کبھی تھا۔ اب اس کا ادراک ممکن ہے اور یہ سائنسی نقطۂ نگاہ سے قطعی طور پر قابلِ قبول ہے۔

قیامت پر ایمان اور انسانی پیش رفت

قیامت پر ایمان حیات و ممات کی گتھّی کو منطقی طور پر سُلجھانے اور ایک قابلِ قبول حقیقت ہونے کے علاوہ انسانی زندگی پر مختلف اثرات مرتّب کرتا ہے جن میں سے مندرجہ ذیل دو اہم ترین ہیں:

۱۔ موت کی اس تصویر میں جو ہمیشہ خوفناک رہی اور جس کا تصوّر ہی انسان کے سکونِ قلب کو درہم برہم کر دیتا تھا ایک مکمّل تبدیلی آگئی ہے۔ قیامت کے اقرار اور ایک ایسی دنیا میں حیات بعد از ممات تسلیم کر لینے سے جہاں ایک بہت وسیع پیمانے پر جاودانی زندگی کی تمام نعمتیں موجود ہوں گی مَوت کی تصویر اتنی بھیانک نہیں رہی جتنی پہلے ہوا کرتی تھی۔ بڑھاپے اور موت کے آثار اب سکونِ قلب میں خلل پیدا نہیں کرتے۔

موت کے خیال سے پیدا ہونے والا اضطراب اور تردّد ہمارے لیے اتنا تکلیف دہ نہیں جتنا کہ مادّہ پرستوں کے لیے ہے لہٰذا ہم اُن کے مقابلے میں ایک زیادہ آرام دہ اور اطمینان بخش زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

حیات بعد از ممات پر ایمان رکھنے والے لوگ ایک مقدّس مقصد کی خاطر ایثار اور شہادت کو خوش آمدید کہتے ہیں کیونکہ وہ موت کو ایک عالی تر اور وسیع تر دُنیا میں نئی زندگی کی تمہید سمجھتے ہیں۔

جب اس حقیقت کو پوری طرح سمجھ لیا جائے کہ انسانی خیالات اور اعمال باقی رہتے ہیں اور ترقّی و نشوونما کے مراحل سے گزر کر اُن کا ایک دوسری دنیا میں ایک عظیم تر شکل میں نمودار ہونا ضروری ہے اور اس امر کا ادراک بھی کر لیا جائے کہ ہمارے تمام اچھّے بُرے اعمال کا حساب کتاب ہوگا اور اس کی جزا یا سزا ملے گی تو پھر یہ احساس یقینی طور پر انسانی اعمال اور کردار پر ایک بڑا صحت مندانہ اثر مرتّب کرتا ہے۔ پس دوسری دُنیا پر ایمان انسان کے نیک اعمال کے لیے بڑا خوشگوار ماحول مہیّا کرتا ہے اور جذبات کے ہیجان کو قابو میں رکھتا ہے۔

مستقل زندگی اور رُوح کی فنا ناپذیری

گو مادّہ پرست قوّتِ خیال، ادراک اور دوسرے نفسیاتی مظاہر کو دماغ اور اعصابی نظام کی مادّی اور کیمیائی خاصیّت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی بنا پر اُن کے مادّی ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں تاہم روح کے مستقل اور غیر مادّی وجود کے پیشِ نظر اُن کی بیان کردہ تعبیر کی خامی واضح ہو جاتی ہے کیونکہ تصوّر، تخیّل اور یادداشت جیسے روحانی مظاہر میں ہم ایسی خاصیتیں پاتے ہیں جو مادّے کی عام خاصیتیں نہیں ہیں۔

ہم اپنے دماغ میں بڑے بڑے اجرامِ فلکی، کہکشاؤں، نظام ہائے

شمسی، پہاڑوں، صحراؤں اور بڑے بڑے دریاؤں کا تصوّر قائم کر سکتے ہیں گو اپنے خارجی وجود کے لحاظ سے یہ چیزیں بہت بڑی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسی طرح ہم آسمانوں اور زمین جیسی عظیم الجثّہ چیزوں کا خیال بھی اپنے دماغ میں قائم کر سکتے ہیں اور اس دماغی تصویر کے وجود کو خود اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تصویر کا محلِ وقوع کہاں ہے؟ ظاہر ہے یہ تصویر ہمارے دماغ کے خلیوں میں قائم نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ خود ہمارے دماغ سے لاکھوں کروڑوں گُنا بڑی ہو سکتی ہے۔ کیا ہمارے لیے کاغذ پر جاپان کے پورے طول و عرض کے مطابق اس ملک کا نقشہ کھینچنا ممکن ہے؟ ہر گز نہیں۔

لہٰذا ایک بڑے وجود کی ایک چھوٹے وجود سے مطابقت کے متحمّل الضدّین مسئلے میں اُلجھے بغیر ہمارے لیے ضروری ہے کہ اس مظہر کی تعبیر کے لیے مابعد الطبیعیاتی قوّتوں کے وجود پر اعتقاد رکھیں۔

مادّے کی عام خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا ہے اس میں مسلسل تبدیلی، قلبِ ہیئت اور توڑ پھوڑ رونما ہوتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس ذہنی تصاویر پائدار اور مستحکم رہتی ہیں اور اُن میں کوئی تغیّر واقع نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ میں نے چند سال پہلے اپنے ایک نوجوان دوست کو کسی محفل میں دیکھا۔ اگر میں اُس محفل کو پچاس سال بعد بھی یاد کروں تو تصوّر میں میرے دوست کا وہی نقشہ آئے گا جو میرے دماغ پر ثبت ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہنی تصاویر مستحکم ہوتی ہیں اور مادّے کی عام خصوصیات سے متاثر نہیں ہوتیں۔ لہٰذا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ تصاویر مادّی نہیں ہوتیں۔

ایک بڑے وجود کی چھوٹے وجود سے عدم مطابقت اور ذہنی تصاویر کا تغیّر ناپذیر ہونا اُن بہت سے دلائل میں سے دو دلیلیں ہیں جو فلسفیوں نے انسانی روح کے مستقل وجود کے ثبوت کے طور پر پیش کی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اِس موضوع پر کئی ایک دلائل ہیں جن کے لیے فلسفے کی کتابوں سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ روح اور روحانی مظاہر مادّے کی عام خصوصیات کے حامل نہیں ہیں۔ وہ جسمانی موت سے کالعدم نہیں ہو جاتے اور بدن سے جدا ہو کر بھی اُن کی ہستی قائم رہتی ہے۔ اس سے موت کے بعد قیامت کا امکان واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے۔

برزخ

آئندہ زندگی اور موت کے بعد حشر، عقل سے ثابت ہیں لیکن عقل آئندہ زندگی کی کیفیت کے بارے میں ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتی۔ اِس رہنمائی کے لیے ہمیں انبیائے کرامؑ اور پیشوایانِ دین (ائمہ علیہم السلام) کے ارشادات کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں قرآن مجید اور احادیثِ رسولؐ سے پتا چلتا ہے کہ ایک دُنیا برزخ نامی بھی ہے جہاں مُردوں کو یومِ جزا یعنی قیامت تک رکھّا جائے گا۔

برزخ اِس دُنیا اور دوسری دُنیا کی درمیانی منزل ہے۔ جب انسان مرتا ہے تو پہلے وہ اسی درمیانی دُنیا میں آتا ہے جہاں وہ ایک مخصوص قسم کی روحانی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس زندگی کی ابتدا قبر سے ہوتی ہے جہاں مُردے سے مختصر سوال جواب کیے جاتے ہیں اور اس کے اعمال اور اعتقادات کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ اگر اُس کے اعتقادات صحیح اور اعمال اچھّے پائے جائیں تو اس کے لیے بہشت کا ایک دریچہ کھول دیا جاتا ہے۔ یوں وہ بہشت کے نظاروں اور لذّتوں سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے اور قیامت تک اس وقت کا انتظار کرتا ہے جب کہ اسے جاودانی مسرّتوں اور نعمتوں سے ہم کنار کر دیا جائے گا۔ اس کے برعکس اگر اُس کے اعمال قبیح اور اعتقادات باطل پائے جائیں تو اُسے دوزخ کی جانب جانے والے راستے پر ڈال دیا جاتا ہے اور اُس کے لیے دوزخ کی ایک کھڑکی کھول دی جاتی ہے نتیجتہً اس کی یہ زندگی بے حد ناخوشگوار اور تلخ ہو جاتی ہے۔ یہ اُس کے لیے انتہائی اذیّت کا عالم ہوتا ہے اور وہ روزِ قیامت اور پاداشِ جرُم کے مسلسل خوف میں گرفتار رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں اُنھیں مُردہ مت کہو۔ درحقیقت وہ زندہ ہیں لیکن تم اُن کی زندگی کا ادراک نہیں کر سکتے۔"

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں اُنھیں مُردہ نہ سمجھو۔ نہیں، وہ درحقیقت زندہ ہیں اور اپنے پروردگار

سے رزق پاتے ہیں"۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے: "آئندہ زندگی کی پہلی منزل قبر ہے۔ اگر کوئی شخص اُس کی صعوبتوں سے بچ جائے تو دوسری منزلیں آسان ہیں لیکن اگر وہ اس منزل پر نہ بچ سکے تو جو کچھ بعد میں آنے والا ہے وہ آسان نہیں ہے"۔

امام علی بن حسین علیہ السّلام نے فرمایا ہے: "قبر یا تو بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے"۔

قیامت

قرآن مجید میں اور رسولِ اکرمؐ اور ائمہؑ علیہم السّلام کی روایات میں قیامت کے بارے میں یوں فرمایا گیا ہے:

" سورج اور چاند تاریک اور بے نور ہو جائیں گے۔ پہاڑ پھٹ جائیں گے اور ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ سیّارے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے۔ دریا خشک ہو جائیں گے اور اُن میں شعلے بھڑکنے لگیں گے۔ آسمانوں اور زمین کی شکلیں مسخ ہو جائیں گی۔ اُس وقت تمام مُردوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ وہ اپنے اعمال کا حساب کتاب دینے کے لیے جمع ہوں گے۔ اللہ کے پاس تمام لوگوں کے اعمال کی مکمّل روئداد موجود ہے۔ اُس میں کوئی کمی بیشی یا ردّو بدل نہیں ہے۔ قیامت کے دن لوگوں کی آنکھوں پر سے پردے اُٹھا دیے جائیں گے اور وہ جسمانی طور پر اپنی آنکھوں سے اپنے اعمال دیکھ سکیں گے۔ اس کے بعد حساب کتاب کا مرحلہ شروع ہوگا۔ ہر چیز کی پوری پوری جانچ پڑتال ہوگی۔ کافر اور ایسے گناہگار جن

کے گناہ قابلِ معافی نہیں ہوں گے دوزخ میں بھیج دیے جائیں گے۔ جو لوگ عالمِ برزخ میں سزا بھگت چکنے کی بنا پر معافی کے سزاوار سمجھے جائیں گے انھیں انبیائے کرامؑ اور ائمہؑ علیہم السّلام کی شفاعت پر معاف کر دیا جائے گا اور انجامِ کار وہ بہشت میں بھیج دیے جائیں گے۔

نیک اور راستباز لوگوں کے اعمال کی جانچ پڑتال کا کام جلدی اور آسانی سے نمٹا دیا جائے گا لیکن جہاں تک کفّار اور گناہگاروں کی ایک کثیر تعداد کا تعلّق ہے اُنھیں بڑی مشکلات کا سامنا ہو گا۔ اُن کے اعمال کے ذرّے ذرّے کی جانچ پڑتال کی جائے گی اور انھیں اپنی کوتاہیوں کے لیے جواب دہی کرنی ہو گی۔ اس میں کافی وقت لگے گا اور ان لوگوں کا یہ وقت بڑی پریشانی میں گزرے گا۔

بہشت

بہشت وہ مقام ہے جہاں پرہیزگار اور راستباز لوگوں کو بھیجا جائے گا۔ یہاں ہر قسم کی مسرّت و آسائش میسّر ہو گی اور انسان جس چیز کی خواہش کرے گا وہ اُسے فوراً مہیّا کی جائے گی۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

"وہاں وہ سب کچھ ہو گا جس کی روح کو خواہش ہو سکتی ہے اور جس سے آنکھوں کو خوشی میسّر آسکتی ہے۔"

بہشت کی نعمتیں اس دُنیا کی نعمتوں اور آسائشوں سے بدرجہا اعلیٰ اور بہتر ہیں۔ کسی شخص نے اُن سے ملتی جُلتی چیزیں نہ کبھی دیکھی ہیں اور نہ اُن کے بارے میں سُنا ہے۔ وہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ جو

شخص بہشت میں داخل ہوگا اُسے حیاتِ جاوداں عطا کی جائے گی اور وہ ہمیشہ وہاں رہے گا۔ بہشت کے کئی طبقے ہیں اور ہر شخص کو اُس کے نیک اعمال کے لحاظ سے مناسب طبقے میں جگہ دی جائے گی۔

دوزخ

دوزخ وہ مقام ہے جہاں کافروں اور بدکردار لوگوں کو رکھا جائے گا۔ یہاں انھیں ان کی بداعمالیوں کی سزا دی جائے گی اور وہ شدید عذاب اور مصائب میں مبتلا ہوں گے۔ دوزخ میں دی جانے والی سزا بے حد سخت اور دردناک ہوگی۔ دوزخ کی آگ فقط جسم کو ہی نہیں بلکہ روح کو بھی جلا کر خاکستر کر دے گی۔ یہ آگ انسان کے وجود سے اُٹھے گی اور انسان کی پوری ہستی کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ قُرآن مجید فرماتا ہے:

"اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ لوگوں کے دلوں سے اُٹھتی ہے۔"

جن لوگوں کو دوزخ میں بھیجا جائے گا انھیں دو گروہوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

پہلا گروہ ایسے کافروں پر مشتمل ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی ہستی سے انکار کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذابِ دوزخ میں مبتلا رہیں گے اور انھیں کبھی نجات نصیب نہ ہوگی۔

دوسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کو مانتے تو ہیں لیکن ان کا ایمان کمزور ہے۔ وہ گناہ کرتے ہیں اور اس وجہ سے سزا کے مستوجب قرار پاتے ہیں۔ انھیں عارضی طور پر دوزخ میں رکھا جائے گا۔

بالآخر جب اُن کے گناہوں کی سیاہی دُھل جائے گی تو انھیں اللہ تعالیٰ کے براہِ راست رحم وکرم یا انبیائے کرامؑ کی شفاعت کے نتیجے میں معاف کر دیا جائے گا اور بہشت میں بھیج دیا جائے گا۔

دوزخ کے بھی کئی طبقے ہیں اور ہر طبقے میں مختلف قسم کے عذاب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ہر شخص کو اس کے گناہوں کی سنگینی کے لحاظ سے مناسب طبقے میں رکھ کر سزا دی جائے گی۔

شفاعت

شفاعت کے اصول کا ذکر قرآن مجید اور رسولِ اکرمؐ اور ائمہ علیہم السلام کی روایات میں آیا ہے لہٰذا اصولی طور پر شفاعت کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ روایات سے مجموعی طور پر جو تاثر ملتا ہے وہ یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ اور ائمہ علیہم السلام کچھ گناہگاروں کی شفاعت فرمائیں گے۔ وہ کہیں گے:

"یا اِلٰہ العالمین! گو یہ شخص گناہگار ہے اور سزا پانے کے لائق ہے لیکن چونکہ تو ارحم الرّاحمین ہے اس لیے ہم تجھ سے گزارش کرتے ہیں کہ اُن چند خوبیوں کی خاطر جو اِس شخص میں ہیں اور جو لحاظ تو ہمارا کرتا ہے اُس کی بِنا پر اس کے گناہوں سے درگزر فرما اور اس پر اپنا رحم کر۔"

اُن کی گزارش قبول کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ اُس گناہگار کو معاف کر دے گا اور اُسے اپنی رحمت سے بہرہ ور فرمائے گا۔

گو آیاتِ قرآنی اور احادیث و روایات کی رُو سے شفاعت کا

اصول ناقابلِ تردید ہے لیکن اس سلسلے میں چند ضروری باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں :

کوئی شفاعت کرنے والا اللہ تعالیٰ کی پیشگی اجازت کے بغیر شفاعت نہیں کرے گا۔

شفاعت فقط قیامت کے دن ہو سکے گی اور اس کی منزل نامۂ اعمال کی مکمّل جانچ پڑتال کے بعد آئے گی۔

شفاعت کرنے والے گناہگاروں کے لیے اللہ تعالیٰ سے فقط رحم کی درخواست کریں گے۔

جب تک انسان برزخ میں رہے گا اور وہاں دی جانے والی سزا بھگتے گا اُس وقت تک شفاعت کا کوئی سوال پیدا نہ ہوگا۔ گو ممکن ہے کہ وہاں بھی رسولِ اکرمؐ یا کسی امامؑ کی سفارش پر کسی گناہگار کی سزا میں تخفیف کر دی جائے لیکن یہ سفارش شفاعت کے زمرے میں نہیں آتی۔

شفاعت کنندگان (ائمہؑ علیہم السّلام) نے خود فرمایا ہے کہ: "اس بات کا خیال رکھو کہ قیامت کے دن تم انسان کی شکل میں حاضر ہو تاکہ ہم تمھاری شفاعت کر سکیں۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کسی کے گُناہ اور بہیمانہ جرائم اتنے سنگین ہوں کہ قیامت کے دن اس کی شکل مسخ ہو کر وحوش کی مانند ہو جائے تو وہ شفاعت کا حق دار نہیں ہوگا۔ بہر صورت اہلیت، شفاعت کی ایک لازمی شرط ہے۔

شفاعت کرنے والوں نے فرمایا ہے کہ ان کی شفاعت بعض گناہوں (مثلاً ترکِ صلوٰۃ) پر محیط نہیں ہوگی۔

ان سب باتوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ہمیں چاہیئے کہ شفاعت

کی اُمّید پر گناہوں کے مرتکب نہ ہوتے رہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہوگا جیسے کوئی شخص اس اُمّید پر زہر پھانک لے کہ ڈاکٹر علاج معالجہ کر کے اُس کی جان بچا لیں گے۔ اس قسم کے احمق شخص کی تباہی یقینی ہے۔

توبہ

آیاتِ قرآنی اور ائمۂ طاہرین کی روایات ہمیں بتاتی ہیں کہ اگر کوئی گناہگار شخص موت سے پہلے توبہ کرے اور اپنے سابقہ گناہوں پر پشیمانی محسوس کرے تو اس کے گناہ بغیر کسی حساب کتاب کے معاف کر دیے جاتے ہیں۔ پس توبہ کا دروازہ سب گناہگاروں کے لیے کھُلا ہے اور مایوسی کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ توبہ گناہوں کو محو کر دیتی ہے۔ تاہم محض زبان سے توبہ استغفار کر لینا یا ایک آدھ آنسو بہا لینا کافی نہیں۔ سچّی توبہ کی کچھ شرائط بھی ہیں جن کی تفصیل حضرت علی علیہ السّلام نے بتائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ توبہ کی کچھ شرطیں ہیں جو یہ ہیں :-

انسان اپنے سابقہ گناہوں پر واقعی اور خلوصِ دل سے پشیمان ہو۔

انسان عزم کرے کہ آئندہ گناہوں سے بچے گا۔

اگر انسان کے ذمّے ایسے حقوق ہوں جن کی ادائیگی سے اُس نے ماضی میں لاپروائی برتی ہو تو اُنھیں ادا کرے۔

حرام غذا کے استعمال کے نتیجے میں انسان کے بدن پر جو چربی چڑھ گئی ہو اُسے ندامت اور ریاضت کے ذریعے پگھلا دے۔

انسان عبادات کی صعوبتیں اسی طرح برداشت کرے جس طرح گناہوں سے لطف اندوز ہوا ہو۔

ان شرائط کو پورا کرنے کے بعد ہی انسان کو زیب دیتا ہے کہ کلمۂ استغفار زبان پر لائے۔

باب چہارم

رہبرانِ انسانیت

صفحہ نمبر

رہبرانِ انسانیت

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، خالقِ کائنات نے انسان کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ اُسے ایسا کرنے کی کوئی حاجت تھی۔ وہ ہر قسم کی ضروریات اور حاجات سے بے نیاز ہے۔ اُس نے انسان کو خود اس کے ارتقا اور تکمیل کی خاطر پیدا کیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان شاہراہِ کمال پر گامزن رہے اور اخلاقی اور مادّی دونوں لحاظ سے ایک عالی تر زندگی کے قابل بن جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ راستہ طے کرنے کے لیے انسان کو ایسے پیشواؤں کی ضرورت پڑتی ہے جو غیر معمولی عِلم اور زُہد کے حامل ہوں تاکہ وہ عام لوگوں کی رہنمائی کر سکیں اور اپنے اقوال و افعال سے اُن کے لیے مثال قائم کر سکیں۔

چونکہ انسانی عِلم اور عقل محدود ہیں لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ ہم سے یہ طے کرنے میں غلطی ہو جائے کہ کون سی چیز ہمارے لیے مفید ہے اور وہ کون سا راستہ ہے جو ابدی بھلائی کی طرف جاتا ہے لہٰذا کچھ ایسے اشخاص کی ضرورت ہے جو مابعد الطبیعیاتی دنیا سے رابطے کی بنا پر صحیح

راستہ تلاش کر سکیں اور اس کی جانب دوسروں کی رہنمائی کر سکیں۔
یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ اس بات کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ خداوندِ عالم جو عقلِ کُل ہے ہمیں اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ سکتا ہے۔ اُس کے لامحدود لطف و کرم کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے منتخب پیغمبروں کے ذریعے، جو خود بھی انسان ہوں، بنی نوع انسان کو ضروری قوانین اور لائحۂ عمل مہیّا کر دے۔

انبیائے کرامؑ اللہ تعالیٰ کے منتخب اور سربرآوردہ بندے ہیں جو اس سے رابطہ قائم کر کے حق و صداقت کا علم حاصل کرتے ہیں اور اسے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس رابطے کو 'وحی' کہا جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ اور ایک نبی کے مابین ایک مخصوص قسم کا تعلّق ہوتا ہے۔ ایک نبی اپنی چشمِ بصیرت سے اسرارِ کائنات کا نظارہ کرتا ہے اور اپنے دل کے کانوں سے احکامِ خداوندی سُنتا ہے اور اُنھیں لوگوں تک پہنچاتا ہے۔

انبیائے کرامؑ معصُوم ہیں

یہ ضروری ہے کہ انبیائے کرامؑ کسی گُناہ، غلطی یا لغزش کا ارتکاب نہ کریں کیونکہ بصورتِ دیگر وہ فرضِ رسالت انجام دینے میں قابلِ اعتماد نہیں رہیں گے لٰہذا نبوّت کے لیے یہ ایک لازمی شرط ہے کہ اس کے حامل منجانب اللہ ہر قسم کے گناہ اور اشتباہ سے محفوظ و مامون ہوں تاکہ لوگ اُن پر سو فی صد اعتماد کر سکیں۔ اگر اُن کا گناہ یا غلطی کرنا ممکن ہو تو وہ نہ تو دوسروں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ بن سکتے ہیں اور نہ ہی اُن کے اعمال، اقوال اور خیالات قابلِ تقلید ضابطۂ اخلاق کا ماخذ

بن سکتے ہیں۔

گناہوں اور غلطیوں سے اِس قسم کی بریت اور پاکیزگی کو 'عصمت' کہا جاتا ہے اور جو شخص اس صفت کا حامل ہو اُسے 'معصوم' کہتے ہیں۔

انبیائے کرامؑ کی تعداد

روایات سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے ۱۲۴۰۰۰ نبی مبعوث فرمائے جن میں سے پہلے حضرت آدمؑ اور آخری حضرت محمدؐ بن عبداللہ تھے۔

انبیائے کرامؑ کے دو گروہ ہیں۔ کئی ایک انبیاءؑ پر وحی نازل ہوئی لیکن انھیں تبلیغ کا فریضہ نہیں سونپا گیا جب کہ کئی انبیاء ایسے تھے جنھیں تبلیغ کرنے کا حکم بھی دیا گیا۔ دوسرے گروہ میں بھی بعض انبیاء ایسے تھے جنھیں خود کوئی شرعی قوانین نہیں دیے گئے بلکہ وہ دوسرے انبیاء کے لائے ہوئے قوانین کی ترویج و اشاعت کرتے رہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی دور میں کئی ایک انبیاء مختلف ملکوں، شہروں یا قصبوں میں دینِ حق کا پرچار کرتے رہے۔

جو سب سے زیادہ جلیل القدر انبیاء مستقل شرعی قوانین دے کر مبعوث کیے گئے اُن کی تعداد پانچ ہے۔ اُن کے اسمائے گرامی اور ان کتابوں کے نام جو اُن پر نازل کی گئیں ذیل میں درج ہیں:

(۱) حضرت نوحؑ ———— صحیفہ
(۲) حضرت ابراہیمؑ ———— صحیفہ
(۳) حضرت موسیٰؑ ———— توراة

(۴) حضرت عیسیٰؑ ——————— انجیل
(۵) حضرت محمدؐ ——————— قرآن

انبیائے کرامؑ کے مقاصد

انبیائے کرامؑ کے لائحۂ کار میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں:
(۱) عدل و انصاف کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا۔
(۲) لوگوں کو تعلیم و تربیت دینا۔
(۳) ہر قسم کی اوہام پرستی، بدمعاملگی، ناجائز امتیاز اور توحیدِ الٰہی، حق و صداقت اور عدل سے انحراف کے خلاف جہاد۔

قرآن مجید فرماتا ہے:
"بلاشبہ ہم نے اپنے پیغمبر واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجے ہیں اور ہم نے اُن کے ساتھ کتاب اور میزان (ضروری قوانین) نازل کی ہے تاکہ بنی نوع انسان عدل قائم رکھیں۔"

پیغمبرِ اسلام کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:-
"یہ وہی (اللہ) ہے جس نے ایک ان پڑھ قوم کے درمیان انہی میں سے ایک شخص کو رسول بنا کر بھیجا جو انھیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور اُنھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پیشتر وہ کھلی گمراہی میں تھے۔"

یہی وہ اعلیٰ مقصد ہے جس کے لیے انبیائے کرامؑ کو مبعوث فرمایا گیا۔

نبوّت کے ثبوت

انبیائے کرامؑ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی نبوّت ثابت کرنے کے لیے ٹھوس اور واضح شہادت پیش کریں۔ یہ شہادت ایک ایسا کارِ نمایاں ہونا چاہیے جو عام آدمی کی قدرت سے باہر ہو تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ ان کا رابطہ عالمِ مابعد الطبیعیات سے ہے اور وہ وہیں سے الہام اور ہدایات حاصل کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے عصا کا اژدہا میں تبدیل ہو جانا اور حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں مُردوں کے زندہ ہونے اور مادر زاد نابیناؤں کے صحت یاب ہونے کے قصّے ناقابلِ تردید ہیں۔ جہاں تک حضرت عیسیٰؑ کے جھولے میں کلام کرنے کا تعلّق ہے یہ قصّہ قرآن مجید نے خود نقل کیا ہے۔

اسی طرح گو پیغمبرِ اسلامؐ کو ایک بے حد پسماندہ قوم میں مبعوث کیا گیا لیکن آپؐ ایسی کتاب لائے جو عِلم، طریقۂ تعلیم اور اسرارِ تخلیق کا شاہکار ہے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس کتاب کا بدل پیش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے۔

اِسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید بے مثل ہے۔ قرآن مجید کئی لحاظ سے اعجاز کا رتبہ رکھتا ہے۔ اِس کا اسلوبِ بیان اتنا مؤثّر ہے کہ دشمنانِ اسلام اسے سحر کہتے تھے اور اس خوف سے لوگوں کو مشورہ دیتے تھے کہ محمدؐ کے قریب نہ جائیں کہیں اُن کا دل میں اُتر جانے والا اندازِ کلام اُنھیں مسحور نہ کرلے اور وہ دینِ اسلام کی جانب راغب نہ ہو جائیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دشمن تک قرآنِ مجید کی غیر معمولی

تاثیر کے معترف تھے۔

قرآن مجید کے اسلوبِ بیان کے علاوہ اِس کے مندرجات کی نوعیت بھی ایسی ہے کہ بڑے مختصر عرصے میں اس نے اقصائے عالم میں غیر معمولی تبدیلیاں پیدا کر دیں اور ایک علمی اور فکری انقلاب برپا کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دلآویز تہذیب کی بنیاد رکھی۔

علاوہ ازیں قرآن مجید نے مختلف سورتوں میں کئی ایک سائنسی صداقتوں کی جانب اشارہ کیا ہے جن کا اُس زمانے کے لوگوں کو قطعاً کوئی علم نہ تھا اور صدیوں بعد محققین نے اُن کی جانب توجہ دی۔ جن مسائل کی جانب اِس قسم کے اشارے کیے گئے ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) زمین کی گردش۔ (سورۂ نمل۔ آیت ۹۰)

(۲) پودوں میں نر اور مادہ خلیوں کی موجودگی (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۳۵)

(۳) تمام ذرّات میں دو متضاد قوّتوں کی موجودگی یعنی ہر جوہر کا منفی چارج والے الیکٹرون اور مثبت چارج والے پروٹون سے مرکّب ہونا۔ (سورۂ ذاریات۔ آیت ۲۹)

(۴) قانون کششِ ثقل (سورۂ رعد۔ آیت ۲)

ان وجوہات کی بنا پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ کتاب جو پیغمبرِ اسلامؐ کا ابدی معجزہ ہے، کسی انسانی ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو عالمِ مابعد الطبیعیات سے رسولِ اکرمؐ کے قلبِ مبارک پر نازل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ کئی ایک سورتوں میں قرآنِ مجید نے کفّار کو چیلنج دیا ہے کہ وہ اِس کا بدل پیش کریں۔ گو آنحضرتؐ کے جانی دشمنوں نے یہ چیلنج قبول کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن وہ کلام اللہ کے مقابلے

میں کوئی چیز پیش کرنے میں ناکام رہے۔

قرآن مجید واشگاف الفاظ میں فرماتا ہے:

"کہہ دو: بلاشبہ اگر تمام انسان اور جنّات اس قرآن کی مثال پیش کرنے کے لیے متحد ہو جائیں تب بھی وہ ایسا نہیں کر سکتے خواہ اُن میں سے بعض، بعض کی مدد ہی کیوں نہ کریں۔"

قرآن مجید کا یہ چیلنج اب بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ یہ مقدّس کتاب اب بھی صلائے عام دے رہی ہے کہ اگر دُنیا کے دانشوروں کو اِس کے الٰہی ماخذ کے بارے میں کوئی شک ہو تو وہ اِس کی مثال پیش کریں۔ اِس چیلنج کو قبول کرنے سے اُن کی معذوری قرآن مجید کے بے مثل ہونے کا کھُلا ثبوت ہے۔

قرآنِ حکیم

انسانی قویٰ کے صریحاً محدود ہونے کی بنا پر کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ قرآن مجید کی خوبیاں کماحقّہٗ بیان کر سکے۔ بس اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ یہ اللہ کا کلام اور خاتم النبیّینؐ کا زندہ معجزہ ہے۔ یہ ایک ایسی کتابِ ہدایت ہے جو انسانیت کے ہر مسئلے میں اور اس کی ترقّی کی ہر منزل پر اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ یہ اس دُنیا میں بھی اور عاقبت میں بھی انسان کی کامیابی کی ضمانت دیتی ہے۔ قرآن مجید خود ارشاد فرماتا ہے:

"بلاشُبہ قرآن اُس راستے کی جانب رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔" (سورۃ بنی اسرائیل۔ آیت ۹)

"یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے تاکہ اِس کے

ذریعے بنی نوع انسان کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے آؤ۔" (سورۂ ابراہیم۔ آیت ۱۰)

"یہ بنی نوع انسان کے لیے ایک محضر نامہ ہے اور جو لوگ پارسا ہیں اُن کے لیے ہدایت اور تنبیہ ہے۔" (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۳۸)

روایت ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: "قرآن ہر گفتار سے اُسی طرح برتر ہے جس طرح اللہ تعالیٰ ساری مخلوق سے برتر ہے۔"

یہ بات قطعاً مناسب ہو گی کہ ہم قرآن مجید کے فضائل کا بیان ائمۂ طاہرینؑ پر چھوڑ دیں کیونکہ وہ اس کی قدر و قیمت اور اہمیّت کو باقی سب لوگوں سے زیادہ جانتے ہیں اور ہدایتِ خلق میں اِس کے شریکِ کار اور رفیق ہیں۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"میں اپنے پیچھے تمھارے درمیان دو وزنی چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ان میں سے ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میرے خانوادے کے امام ہیں۔ یہ دونوں چیزیں یومِ قیامت تک ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گی"

لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ قرآن مجید کی خوبیوں کے بارے میں ائمہ علیہم السّلام نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اُسے ناطق اور ناقابلِ تردید سمجھیں۔ مُلّا باقر مجلسی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب بحار الانوار کی اُنیسویں جلد میں کتابِ الٰہی کے بارے میں ائمہ علیہم السّلام کے بہت سے اقوال نقل کیے ہیں ہم ان میں سے چند ایک ذیل میں درج کرتے ہیں:

حارث ہمدانی کہتا ہے کہ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ لوگ مسجد میں ایک دوسرے سے تکرار کر رہے ہیں۔ میں امام علی علیہ السّلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا "کیا آپ نہیں دیکھ رہے کہ لوگ آپس

میں جھگڑ رہے ہیں ؟" آپ نے فرمایا : "کیا وہ ایسا کر رہے ہیں ؟" میں نے جواب دیا : "جی ہاں" اس پر آپ نے کہا : "میں نے رسولِ اکرمؐ کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ جلد ہی مسلمانوں میں نااتفاقی اور باہمی نزاع رونما ہوگا" میں نے عرض کیا : "کیا اس صورتِ حال کے خطرناک نتائج سے بچنے کا کوئی ذریعہ بھی ہے ؟" امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا : "ہاں! وہ اللہ کی کتاب ہے ۔ وہ ہمیں بتاتی ہے کہ ماضی میں کیا کچھ ہوا اور آئندہ کیا ہونے والا ہے ۔ وہ تمام تنازعات کا فیصلہ کرتی ہے ۔ یہ کوئی مذاق نہیں بلکہ حرفِ آخر ہے ۔ جو ظالم شخص اس سے روگردانی کرے اللہ تعالیٰ اسے تباہ کر دے گا ۔ جو شخص کسی اور ذریعے سے ہدایت حاصل کرنا چاہے وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک جائے گا ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک محکم زنجیر ہے ۔ یہ ایک عاقلانہ گفتگو ہے ۔ یہ صراطِ مستقیم ہے ۔ اسے من کی موج سے نہیں بدلا جاسکتا نہ ہی اسے زبان سے توڑ مروڑ کر کوئی اور معنی پہنائے جاسکتے ہیں ۔ اہلِ علم اس سے نہیں اُکتاتے ۔ یہ مسلسل استعمال سے فرسودہ نہیں ہوتا ۔ اس کے عجائبات لامحدود ہیں ۔ جب جنوں نے اسے سُنا تو حیرت زدہ ہوکر رہ گئے اور کہا : "ہم نے بے مثل قُرآن سُنا ہے" جو اسے نقل کرے وہ سچ بولتا ہے اور جو اس کے مطابق فیصلہ کرے وہ عدل کرتا ہے ۔ جو اس پر عمل کرے وہ اجر کا مستحق ہے اور جو دوسروں کو اس کے مطابق چلنے کی تلقین کرے وہ ان کی رہنمائی صراطِ مستقیم کی جانب کرتا ہے ۔ اے حارث! اس کی پیروی کرنا اپنا وظیفہ بنالو"

اس حدیث کے چند لطیف نکات کی جانب توجّہ مبذول کرانا نامناسب نہ ہوگا ۔ رسولِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ قُرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ آئندہ

کیا ہوگا۔ اِس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہ قرآن مجید نے آئندہ رونما ہونے والے واقعات کی جانب اشارہ کیا ہے اور یا یہ کہ جو واقعات سابقہ قوموں کو پیش آئے بالکل اُنہی جیسے واقعات مسلمانوں کو بھی پیش آئیں گے
قرآن مجید فرماتا ہے: "بلاشبہ تم منزل بہ منزل آگے بڑھو گے۔"
آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو ظالم شخص قرآن مجید سے روگردانی کرے گا اللہ تعالیٰ اُسے تباہ کر دے گا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی ظالم و جابر انسان اس کتابِ الٰہی کے ساتھ اس انداز میں دست درازی نہیں کر سکتا کہ مسلمان اسے مکمل طور پر پسِ پشت ڈال دیں۔ اِس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس میں کبھی بھی کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ جب حضورؐ نے فرمایا کہ اسے من کی موج سے بدلا نہیں جا سکتا تو اس وقت بھی آپ کی مراد یہی تھی۔ خود غرض لوگوں نے قرآن مجید کی غلط تاویلیں تو کی ہیں لیکن اس کا متن ہمیشہ تغیّر ناپذیر رہا ہے۔
اس حدیث سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اگر مسلمان اپنے نظریاتی اختلافات کا حل قرآن مجید میں تلاش کرتے تو وہ اِسے بہترین قاضی اور ثالث پاتے کیونکہ یہ تمام اہم معاملات پر دو ٹوک فیصلے دیتا ہے۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ مسلمانوں نے قرآن مجید سے بے اعتنائی برتی جس کے نتیجے میں حالات اتنے ناگفتہ بہ ہو گئے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں نے ایک دوسرے پر کفر کے فتوے صادر کرنے شروع کر دیے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!
قرآن مجید کا ذکر کرتے ہوئے امیر المؤمنین علیہ السّلام نے فرمایا ہے:
"یہ کتاب ایک ایسا نور ہے جو کبھی محو نہیں ہوگا۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے

جو کبھی ماند نہیں پڑے گا۔ یہ ایک ایسا سمندر ہے جس کی تہ تک کبھی نہیں پہنچا جاسکے گا۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے جس سے بھٹکنا ممکن نہیں۔ یہ ایک ایسی کرن ہے جو کبھی ہلکی نہیں پڑتی۔ یہ ایک ایسی شہادت ہے جس کی دلیل کبھی کمزور نہیں ہو گی۔ یہ ایک ایسا علاج ہے جس کے مخالفانہ ردِّ عمل کا کوئی خطرہ نہیں۔ یہ ایک ایسا شرف ہے جس کی تائید کرنے والے کبھی شکستِ فاش سے دوچار نہ ہوں گے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی حمایت کرنے والے کبھی مایوس نہ ہوں گے۔ یہ ایمان کا سب سے اہم سرچشمہ ہے۔ یہ علم کا منبع ہے۔ یہ اسلام کا بنیادی پتّھر ہے۔ یہ ایک ایسا سمندر ہے جو کبھی خشک نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک ایسا چشمہ ہے جس کا پانی کبھی نہیں سوکھتا۔ یہ ایک ایسا آب گیر ہے جس کے مد کا کوئی جزر نہیں۔ یہ ایک ایسی منزل ہے جس کے راستے سے انسان بھٹک نہیں سکتا۔"

امام ابو عبداللہؑ نے فرمایا ہے: "قرآن مجید ایک لافانی کتاب ہے۔ یہ اس وقت تک نافذ العمل رہے گی جب تک سورج اور چاند قائم ہیں۔"

تلاوتِ قرآن کے فضائل

قرآن مجید ایک الہامی دستور ہے جو اس دُنیا اور عاقبت میں انسان کی فلاح و بہبود اور کامیابی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اِس کی ہر آیت شمعِ ہدایت ہے۔ جو شخص کامیابی حاصل کرنے کا خواہش مند ہو اُس کے لیے ضروری ہے کہ اِس مقدّس کتاب سے وابستگی رکھے اور اِس

کی آیات کو اپنے خیالات کا جزو بنا لے۔ رسولِ اکرمؐ اور ائمۂ طاہرینؑ کے ایسے متعدد اقوال ہیں جن میں باقاعدگی سے قرآنِ مجید کی تلاوت کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

امام محمد باقر علیہ السّلام سے روایت ہے کہ نبیِّ اکرمؐ نے فرمایا:

"جو شخص دس آیات کی تلاوت کرے وہ اپنے وظیفے میں کوتاہی کا مرتکب نہیں سمجھا جائے گا۔ جو شخص سو آیات کی تلاوت کرے اس کا نام اُن لوگوں کی فہرست میں شامل کیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ جو شخص دو سو آیات کی تلاوت کرے اس کا نام اللہ کے اطاعت گزار بندوں میں شمار ہوگا اور جو شخص پانچ سو آیات پڑھے اُس کا نام اُن لوگوں کی فہرست میں درج ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اَن تھک کوشش کرتے ہیں۔"

امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے: "قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کے ساتھ عہد نامہ ہے۔ یہ ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ اِس عہد نامے کو مدِّ نظر رکھے اور اس کی پچاس آیات روزانہ پڑھے۔"

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ: "ایک مصروف تاجر کے منڈی سے واپس آنے اور سو جانے کے درمیانی وقفے میں قرآن مجید کا ایک سورہ پڑھنے میں کون سا امر مانع ہے؟ اگر وہ ایسا کرے (یعنی اِس دوران میں قرآن مجید کے ایک سورے کی تلاوت کرے) تو دس نیکیاں اُس کے نامۂ اعمال میں درج کی جائیں گی اور دس خطائیں محو کر دی جائیں گی۔"

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ: "قرآن مجید کی تلاوت کی طرف خاص

توجہ دو کیونکہ بہشت کے اتنے ہی درجے ہیں جتنی اِس مقدّس کتاب کی آیات ہیں۔ قیامت کے دن قُرآن مجید کی تلاوت کرنے والے سے کہا جائے گا کہ "تلاوت کرو اور بلند تر ہو جاؤ" چنانچہ جب وہ ایک آیت کی تلاوت کرے گا تو اسے ایک بلند تر درجے پر فائز کیا جائے گا"

متعدّد احادیث سے پتا چلتا ہے کہ قرآن مجید زبانی پڑھنے کی بجائے اس کے ایک نسخے سے ناظرہ تلاوت کرنا زیادہ ثواب کا موجب ہے۔

اسحاق بن عمرو نے امام جعفر صادق علیہ السّلام سے عرض کیا کہ میں نے قُرآن مجید حفظ کر رکھا ہے اور دریافت کیا کہ آیا وہ کتاب اللّٰہ کی تلاوت اِس کے ایک نسخے سے کرے یا زبانی کرے۔

امام علیہ السّلام نے فرمایا کہ قُرآن مجید کے نسخے سے تلاوت کرنا بہتر ہے کیونکہ اس مقدّس کتاب پر نگاہ ڈالنا بھی ایک پسندیدہ فعل ہے

احادیث میں قرآن مجید گھر میں پڑھنے کے فضائل بیان کیے گئے ہیں جب کوئی شخص اپنے گھر میں قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے تو اس کے بیوی بچّوں کو بھی اُس کے نقشِ قدم پر چلنے کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے۔ جب کسی آبادی کے مختلف گھروں سے تلاوتِ قرآن کی آواز آتی ہے تو اس کا اثر بڑا دل خوش کُن ہوتا ہے۔

ائمۂ طاہرین نے فرمایا ہے کہ کسی گھر میں قُرآن مجید کی تلاوت اُس کے مکینوں کے لیے رحمتِ الٰہی کے نزول کا باعث بنتی ہے۔ اس گھر میں فرشتے اُترتے ہیں اور شیطان وہاں سے بھاگ نکلتا ہے۔ جس گھر میں قرآن مجید نہ پڑھا جائے وہاں شیاطین بسیرا کر لیتے ہیں اور فرشتے اُس سے دُور دُور رہتے ہیں۔ (اصول الکافی)

رسولِ اکرمؐ اور ائمہؑ طاہرین کے بہت سے ایسے مصدّقہ اقوال ہیں جن میں تلاوتِ قرآن کی تاکید کی گئی ہے اور اس کے اجر کی صراحت بھی کردی گئی ہے۔ تاہم کچھ ایسے دروغ باف بھی گزرے ہیں جن کی تسلّی ان اقوال سے نہیں ہوئی۔ انھوں نے کلام اللہ کے بعض مخصوص سوروں کے ثواب کے بارے میں روایات گھڑلی ہیں اور انھیں حضور سرورِ کائناتؐ اور ائمہؑ علیہم السّلام سے منسوب کردیا ہے۔

قرآن مجید کے بارے میں تفکّر

قرآن مجید مسلمانوں کو اپنے معانی اور مقاصد کے بارے میں غور و فکر کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"تو کیا وہ قرآن کے بارے میں تفکّر نہیں کریں گے یا کیا اُن کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟" (سورۂ محمد۔ آیت ۲۴)

یہ آیت اُن لوگوں کو سخت سرزنش کرتی ہے جو قرآن مجید کے بارے میں غور و فکر نہیں کرتے۔ امام علی ابن الحسینؑ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ قرآن مجید خزانوں کی مانند ہے۔ جب کبھی کوئی خزانہ کھولا جائے تو انسان کو چاہیے کہ اُس پر نگاہ ڈالے تاکہ اُسے پتا چلے کہ اُس میں کیا ہے۔

ابوعبدالرحمٰن السلمیٰ کا کہنا ہے کہ صحابۂ رسولؐ بیک وقت دس آیات سیکھتے تھے اور جب تک اُنھیں پوری طرح سمجھ نہیں لیتے تھے اور اُن پر عمل پیرا نہیں ہو جاتے تھے اگلی دس آیات کی تعلیم حاصل نہیں کرتے تھے۔

قرآن مجید کا بے مثل ہونا

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک معجزہ ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے ساری دنیا کو دعوتِ اسلام دی اور ہر انسان کو اسے قبول کرنے کو کہا۔ آپ نے قرآن مجید کو اپنی نبوّت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا اور اعلان فرمایا کہ اس کی مثل تیّار کرنا ممکن نہیں آپ نے تمام لوگوں کو چیلنج دیا اور فرمایا کہ اگر وہ اجتماعی کوششوں سے بھی اس کی نظیر تیار کر سکیں تو پیش کریں۔ پھر آپ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور کہا کہ وہ اس جیسے دس سورے ہی تیار کر کے دکھائیں اور بالآخر فرمایا کہ دس نہ سہی فقط ایک سورہ ہی ایسا پیش کریں جو کتاب اللہ کا مقابلہ کر سکے۔

عربوں کی فصاحت و بلاغت مانی ہوئی تھی اور اگر اُن کے بس میں ہوتا تو وہ ضرور قرآن مجید جیسا ایک سورہ تیار کر لاتے اور یوں (نعوذ باللہ) رسولِ اکرمؐ کے دعوئے نبوّت کو باطل ثابت کر دیتے۔ اِس صورت میں انھیں حضورؐ کے خلاف کئی ایک جنگیں لڑنے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی اور وہ لاتعداد پریشانیوں اور صعوبتوں سے محفوظ رہتے۔

تاہم عربوں نے آنحضرتؐ کا چیلنج قبول نہیں کیا کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ قرآن مجید کی مثل تیار کرنا ممکن نہیں۔ اُن میں سے کئی ایک نے اسلام قبول کر لیا۔ باقی اپنی ضد پر اڑے رہے اور عقلی بحث و تحیص کے ذریعے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی بجائے جنگ و جدل کا راستہ اختیار کیا۔ اِس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

" (اے رسولؐ!) کہہ دو کہ بلاشبہ اگرچہ تمام بنی نوع انسان
اور جنّات اکٹھّے ہو جائیں تاکہ قرآن کا مثل تیّار کرسکیں پھر
بھی وہ اس کی نظیر پیش نہ کر پائیں گے خواہ وہ ایک دوسرے
کے مددگار ہی کیوں نہ بن جائیں۔" (سورہ الاسراء۔آیت ۸۸)

ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی اور اسلام کے دوسرے دشمن اس مقدّس مذہب کی تحقیر اور اس کی کتاب کی وقعت کم کرنے کی کوشش میں ہر سال بلکہ ہر مہینے لاکھوں کروڑوں ڈالرخرچ کرتے ہیں۔ اگر وہ قرآن مجید کے سوروں جیسا ایک سورہ بھی پیش کرسکتے تو اُن کی مقصد برآری کا یہ بالکل آسان طریقہ ہوتا۔" وہ اللہ کے نور کو پھونکوں سے بُجھانا چاہتے ہیں لیکن کفّار خواہ کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کریں اللہ اپنے نور کو استحکام بخشے گا۔"

عموماً کچھ عرصہ مشق کرنے کے بعد کوئی ادبی اسلوب بھی اپنایا جا سکتا ہے یا اُس کی نقل اُتاری جا سکتی ہے لیکن اس قاعدے کا اطلاق قرآن مجید پر نہیں ہوتا کیونکہ اس کا ایک منفرد اسلوب ہے جس کا سیکھنا ممکن نہیں۔ اگر قرآن مجید رسولِ اکرمؐ کے دماغ کی تخلیق ہوتا تو حضورؐ کے جو خطبات دستیاب ہیں کم از کم اُن میں سے چند ایک کا ادبی رنگ وہی ہوتا جو قرآن مجید کا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عرب شاعر یا مصنّف مختلف اصنافِ ادب مثلاً قصیدہ، ہجو، مرثیہ یا غزل میں سے فقط ایک یا دو اصناف کے سلسلے میں منفرد مقام حاصل کرتا ہے لیکن قرآن مجید نے متعدد اصناف کا احاطہ کیا ہے اور ہر صورت میں اس کا انداز لاثانی اور یکتا ہے۔ ظاہر

ہے کہ اِس کارِ عظیم کی انجام دہی بنی نوع انسان کے بس کی بات نہیں۔

ایک جاودانی معجزہ

جیساکہ ہم جانتے ہیں کہ ایک نبی کو لوگوں کی جانب سے سندِ قبولیّت اُسی وقت ملتی ہے جب وہ ایک معجزے کی شکل میں اپنی نبوّت کا ثبوت فراہم کرے۔ چونکہ سابقہ انبیائے کرامؑ کی دعوتوں کا دائرۂ کار مختصر اور اُن کی نوعیت محدود تھی لہٰذا جو ثبوت اُنھوں نے اپنی نبوت کے بارے میں پیش کیے وہ بھی غیر جاودانی تھے۔ اُن کے معجزات صرف چند لوگوں نے دیکھے اور پھر دوسروں کو ان کے بارے میں عالمگیر شہادت کے ذریعے اطّلاع دی۔ لیکن چونکہ اسلام ایک جاودانی دین ہے لہٰذا اِس کے معجزے یعنی قرآن مجید کا بے مثل ہونا بھی جاودانی ہے۔ اِس امرِ واقعہ سے ہم دو نتائج اخذ کرتے ہیں یعنی :

(۱) قرآن مجید سابق انبیائے کرامؑ کے معجزات سے افضل ہے اور

(۲) سابقہ نبوّتوں کے ثبوت اختتام پذیر ہونے پر اِن نبوّتوں کا دَور بھی ختم ہوگیا۔

قرآن مجید کی ایک اور خصوصیت بھی ہے جو دوسرے انبیاءؑ کے معجزات پر اِس کی افضلیّت ثابت کرتی ہے اور وہ یہ کہ یہ تمام بنی نوع انسان کی ہدایت کا بیڑا اُٹھاتا ہے اور نقطۂ کمال تک اُن کی پیش رفت کی ضمانت دیتا ہے۔ اِس نے اُن اُجڈ اور سرکش عربوں کو نورِ ہدایت سے بہرہ ور کیا جن میں دُنیا جہان کی خامیاں موجود تھیں وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ حصولِ علم سے کتراتے تھے اور قبائلی جنگوں

اور خود ستائی میں مصروف رہتے تھے۔ اِس مقدّس کتاب نے اُنھیں ایک ایسی قوم میں تبدیل کر دیا جس نے علوم و فنون کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے، ایک شاندار تاریخ کو جنم دیا اور بہترین عادات اپنائیں ؎

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہُدیٰ کا — کہ ہے ساری مخلوق کُنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسَرا کا — خلائق سے ہے جس کو رشتہ وِلا کا

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دُنیا میں انساں کے انساں

اگر کوئی شخص تاریخ اسلام پر نگاہ ڈالے اور آنحضرتؐ کے اُن اصحاب کے احوالِ زندگی کا مطالعہ کرے جنھوں نے اسلام کی خاطر اپنی جانیں قُربان کر دیں تو اُس پر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید نے اُن کے خیالات اور معتقدات پر کتنا گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہ قرآن مجید ہی تھا جس نے اُنھیں جہالت کی گہرائیوں سے اُٹھا کر علم و دانش اور کمال کی بلندیوں پر متمکّن کیا اور اُنھیں اللہ کے دین کی خاطر سرفروشی کی رغبت دلائی۔ اِس نے اُن لوگوں کے دلوں کو منوّر کیا جو بُتوں کو پُوجتے تھے۔ قبائلی جنگوں میں مصروف رہتے تھے اور ایک دوسرے کے مقابلے میں قبائلی تفاخر میں سبقت لے جانا اپنا محبوب مشغلہ سمجھتے تھے۔ یہ قُرآن مجید کی بدولت ہی ممکن ہو سکا کہ اَسّی سال کی قلیل مدّت میں مسلمانوں نے اتنے وسیع علاقے فتح کیے جتنے دوسری اقوام آٹھ صدیوں میں بھی نہ کر سکی تھیں۔

قرآن مجید اور علم و دانش

قرآن مجید کی کئی آیات میں یہ بات بالتصریح بیان کی گئی ہے کہ رسولِ اکرمؐ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ کسی شخص نے کبھی بھی اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا اور اس کی صحت کے بارے میں واضح ثبوت بھی موجود ہے تاہم اَن پڑھ ہونے کے باوجود آپ نے ایک ایسی کتاب دُنیا کے سامنے پیش کی جو علم و دانش کا انمول خزانہ ہے اور جس کی روشنی نے مشرق اور مغرب کے فلسفیوں، دانشوروں اور مفکّروں کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ یہ امر بجائے خود قرآن مجید کے معجزہ ہونے کی بیّن دلیل ہے۔

تاہم اگر بالفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ آنحضرتؐ پڑھے لکھّے تھے تو اس صورت میں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے پڑھنا لکھنا اُن لوگوں سے سیکھا جن کے درمیان اُنھوں نے پرورش پائی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں حضورؐ جس معاشرے میں پروان چڑھے اُس کے افراد یا تو مُشرک تھے جو خیالی قصّے کہانیوں اور خرافات پر اعتقاد رکھتے تھے اور یا تحریف شدہ عیسائیت اور یہودیت کے پیرو تھے جو عہد نامۂ عتیق اور عہد نامۂ جدید کو اپنے عِلم کا منبع و ماخذ سمجھتے تھے۔ تاہم قرآن مجید میں اِن لوگوں کی اوہام پرستی اور بیہودہ اعتقادات کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ قرآن مجید کی کئی ایک آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان آیات میں اُس کی صفات اسی انداز میں بیان کی گئی ہیں جو اُس کی ذاتِ اقدس کے شایانِ شان ہے اور یہ اعلان کیا گیا ہے کہ وہ

ہر عیب اور نقص سے پاک اور مبرّا ہے۔ ذیل میں چند آیات نمونے کے طور پر نقل کی جاتی ہیں :

"وہ کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے حالانکہ وہ اس سے پاک ہے بلکہ جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے سب اُسی کا ہے اور سب اُسی کے فرمانبردار ہیں۔" (سورۃ البقرہ۔ آیت ۱۱۶)

"(وہی) آسمان اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کی نسبت صرف کہہ دیتا ہے کہ ہو جا۔ پس وہ (خود بخود) ہو جاتا ہے۔" (سورۃ البقرہ۔ آیت ۱۱۷)

"اللہ ہی وہ (ذات پاک) ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں (وہ) زندہ ہے (اور) سارے جہان کا سنبھالنے والا ہے۔ اُس کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اُسی کا ہے۔" (سورۃ البقرہ۔ آیت ۲۵۵)

"وہی تو وہ (خدا) ہے جو ماں کے پیٹ میں تمھاری صورت جیسی چاہتا ہے بناتا ہے۔" (سورۃ آل عمران۔ آیت ۵)

"اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی (ہر چیز پر) غالب (اور) دانا ہے۔" (سورۃ آل عمران۔ آیت ۶)

"(لوگو!) وہی اللہ تمھارا پروردگار ہے۔ اُس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ تم اسی کی عبادت کرو اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔"

(سورہ الانعام۔ آیت ۱۰۳)

"اُس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ (لوگوں کی) نظروں

کو خوب دیکھتا ہے اور وہ بڑا باریک بیں اور خبردار ہے "
(سورۂ الانعام - آیت ۱۰۴)

" اللہ ہی پہلے بھی پیدا کرتا ہے اور وہی پھر دوبارہ زندہ بھی کرتا ہے۔ تو تم کدھر اُلٹے چلے جا رہے ہو۔؟ "
(سورۂ یونس - آیت ۳۴)

" اللہ وہی تو ہے جس نے آسمانوں کو جنھیں تم دیکھتے ہو بغیر سہارے کے کھڑا کر دیا۔ پھر عرش (کے بنانے) پر آمادہ ہوا اور سورج اور چاند کو (اپنا تابعدار) بنایا جن میں سے ہر ایک مقرّرہ وقت تک چلا کرتا ہے۔ وہی (دُنیا کے) ہر ایک کام کا انتظام کرتا ہے اور اس غرض سے کہ تم لوگ اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہونے کا یقین کرو (اپنی) آیتیں تفصیل وار بیان کرتا ہے۔
(سورۂ الرعد - آیت ۲)

" اور وہی اللہ ہے۔ اس کے سوا کوئی قابلِ پرستش نہیں۔ دُنیا اور آخرت میں اُسی کی تعریف ہے اور اُسی کی حکومت ہے اور تم لوگ (مرنے کے بعد) اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے "
(سورۂ القصص - آیت ۷۰)

" وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی قابلِ عبادت نہیں (حقیقی) بادشاہ، پاک ذات (ہر عیب سے) بَری، امن دینے والا، نگہبان، غالب، زبردست بڑائی والا۔ یہ لوگ جس کو (اُس کا) شریک ٹھہراتے ہیں اُس سے پاک ہے "
(سورۂ الحشر - آیت ۲۳)

"وہی وہ خدا ہے جس کے سوا کوئی قابلِ عبادت نہیں۔ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا۔ وہی بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔"

(سورۃ الحشر۔ آیت ۲۲)

یہ ہے وہ انداز جس سے قرآن مجید کائنات کے خالق و مالک اللہ تبارک و تعالیٰ کا تعارف کراتا ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے وہ عین مطابقِ عقل اور علمی دلائل سے ہم آہنگ ہے۔ ایک جاہلانہ ماحول میں جنم لینے والے اور پرورش پانے والے انسان سے یہ توقّع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اتنے بلند خیالات پیش کرے گا۔

قرآن مجید نے انبیائے کرامؑ کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اِس سے اُن برگزیدہ ہستیوں کی تقدیس اور اُن کے مِشن کی صداقت کا اظہار ہوتا ہے۔ اِس بارے میں چند مثالیں درجِ ذیل ہیں:

"جو لوگ ہمارے نبیؐ اُمّی رسولؐ کے قدم بقدم چلتے ہیں جس (کی بشارت) کو اپنے ہاں توریت اور انجیل میں لکھّا ہوا پاتے ہیں اور (وہ نبی) جو اچھّے کاموں کا حکم دیتا ہے اور بُرے کاموں سے روکتا ہے۔" (سورہ الاعراف۔ آیت ۱۵۷)

"وہی تو ہے جس نے جاہلوں میں اُن ہی میں کا ایک رسولؐ بھیجا جو اُن کے سامنے اُس کی آیتیں پڑھتا اور اُن کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور عقل کی باتیں سکھاتا ہے اگرچہ اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔" (سورۃ الجمعہ۔ آیت ۲)

"اور تمھارے واسطے یقیناً وہ اجر ہے جو کبھی ختم ہی نہ ہوگا۔"

(سورۃ القلم۔ آیت ۳)

" اور جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ جن چیزوں کو تم پوجتے ہو میں یقیناً اُن سے بیزار ہوں۔"

(سورۂ الزخرف۔ آیت ۲۶)

" اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو سارے آسمان اور زمین کی سلطنت کا انتظام دکھاتے رہے تاکہ وہ (ہماری وحدانیت کا) یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔" (سورۂ الانعام۔ آیت ۷۶)

" اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ اور یعقوبؑ عطا کیے۔ ہم نے سب کی ہدایت کی اور اس سے پہلے نوحؑ کی (بھی)، ہم ہی نے ہدایت کی اور انہی (ابراہیمؑ) کی اولاد سے داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ اور یوسفؑ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ (سب کی ہم نے ہدایت کی) اور نیکو کاروں کو ہم ایسا ہی صلہ عطا فرماتے ہیں اور (ہم نے) زکریاؑ اور یحییٰؑ اور عیسیٰؑ اور الیاس (سب کی ہدایت کی) اور یہ سب (خدا کے) نیک بندوں میں سے ہیں۔" (سورۂ الانعام آیت ۸۵)

" اور اسمٰعیلؑ اور الیسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ (کو بھی ہدایت کی) اور سب کو سارے جہانوں پر فضیلت عطا کی اور (صرف انہی کو نہیں بلکہ) اُن کے باپ داداؤں اور اُن کی اولاد اور اُن کے بھائی بندوں میں سے (بہتیروں کو) منتخب کیا اور انھیں سیدھی راہ کی ہدایت کی۔" (سورۂ الانعام۔ آیت ۸۶، ۸۷)

" ہم نے داؤدؑ اور سلیمانؑ کو علم عطا کیا اور دونوں نے کہا خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں اپنے بہتیرے ایماندار بندوں پر فضیلت دی۔" (سورۂ النمل۔ آیت ۱۵)

"یہ انبیاء جنھیں اللہ نے اپنی نعمت دی آدم کی اولاد سے ہیں اور اُن کی نسل سے جنھیں ہم نے (طوفان کے وقت) نوحؑ کے ساتھ (کشتی پر) سوار کر لیا تھا اور ابراہیمؑ اور یعقوبؑ کی اولاد سے ہیں اور اُن لوگوں سے ہیں جن کی ہم نے ہدایت کی اور اُنھیں منتخب کیا۔ جب اُن کے سامنے خدا کی (نازل کی ہوئی) آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو وہ زار و قطار روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے تھے۔" (سورۂ مریم۔ آیت ۵۸)

قرآن مجید انبیائے کرامؑ کا تذکرہ اس انداز سے کرتا ہے۔ اِس کے برعکس عہد نامہ ہائے عتیق و جدید میں ان بزرگ ہستیوں سے بیہودہ اور اخلاق سے گرے ہوئے قصّے منسوب کیے گئے ہیں اور انھیں فسق و فجور، زنا کاری اور شراب نوشی کا مرتکب ٹھہرایا گیا ہے۔ ایسے قصّے نہ تو عقلِ سلیم سے مطابقت رکھتے ہیں اور نہ ہی اخلاقی اقدار کے معیار پر پورے اُترتے ہیں لہٰذا عقل اس مفروضے کو باور کرنے سے قاصر ہے کہ قرآن مجید پر مبنی پاک و پاکیزہ اسلامی تعلیمات کے سلسلے میں یہودیت یا عیسائیت سے استفادہ کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی یک رنگی

یہ بات تجربے سے ثابت ہے کہ مکر و فریب اور دروغ بیانی کا نتیجہ تناقص بالذّات اور بے ربط بیاناتِ کی شکل میں نکلتا ہے۔ یہ صورتِ حال بالخصوص اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب متعلقہ شخص کا تعلق سالہا سال تک قانون، معاشرتی امور اور

مذہبی عقائد وغیرہ جیسے مختلف النوّع موضوعات سے رہا ہو۔ یہ قدرتی امر ہے کہ ایک دروغ باف شخص کسی نہ کسی وقت تذبذب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور بے جوڑ باتیں کرنے لگتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ دروغ گو کی یادداشت کمزور ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے مختلف موضوعات مثلاً قانون، اقتصادیات معاشرتی اداروں اور اخلاقیات پر گفتگو کی ہے۔ اس نے فلکیات، تواریخ اور جنگ اور صلح کے قواعد و ضوابط کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس نے فرشتوں، ستاروں، ہواؤں، سمندروں، پودوں، جانوروں اور یوم قیامت وغیرہ کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ موضوعات کی اس کثرت کے باوجود اس کے مندرجات میں کہیں بھی کوئی تضاد یا تناقص نہیں ہے حضرت موسیٰؑ کا قصّہ متعدّد بار بیان کیا گیا ہے اور ہر دفعہ اس کی ایک نئی اہمیّت اجاگر ہوتی ہے تاہم قصّے کے اصل واقعات میں کہیں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

جب ہم یہ امر ملحوظِ خاطر رکھیں کہ قرآنِ مجید سالہا سال میں وقتاً فوقتاً نازل ہوا تو اُس کی یک رنگی کی اہمیّت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس خصوصیت کی جانب اِن الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

> "تو کیا یہ لوگ قرآن میں بھی غور نہیں کرتے اور (یہ خیال نہیں کرتے کہ) اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے (آیا) ہوتا تو وہ ضرور اس میں بڑا اختلاف پاتے۔"
>
> (سورۃ النساء - آیت ۸۲)

یہ آیت لوگوں کی توجّہ ایک ایسی حقیقت کی جانب مبذول

کراتی ہے جس سے وہ وجدانی طور پر آگاہ ہیں۔ اُنھیں علم ہے کہ ایک دروغ باف شخص کے بیانات کا متضاد اور بے ربط ہونا ضروری ہے لیکن قرآن مجید اس عیب سے مبرّا ہے۔ یک رنگی اور ہم آہنگی اس کے مندرجات کی خصوصیت ہے۔

جن لوگوں نے زمانۂ قبل از اسلام کی تواریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اُن دنوں حالات کس قدر ناگفتہ بہ تھے۔ لوگوں کے اخلاق بے حد پست ہو چکے تھے۔ لوٹ مار اور دنگا فساد ایک عام بات تھی۔ بدّو عرب معمولی سی اشتعال انگیزی پر مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے تھے اور قبائلی جنگ کا سلسلہ چھڑ جاتا تھا۔ اُن کے اعتقادات مشرکانہ اور انداز وحشیانہ تھے۔ کوئی اجتماعی مذہب نہ تھا اور نہ ہی کوئی منظّم حکومت تھی۔ لوگوں کی اکثریت بُت پرست تھی۔ مختلف قبائل مختلف دیوی دیوتاؤں کو پوجتے تھے۔ جُوا اُن کی دن رات کی دل لگی تھی۔ اُن میں بہت سی مذموم رسمیں رائج تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا اپنی سوتیلی ماں کو جائداد کا ایک حصّہ اور اپنی منکوحہ تصوّر کرتا تھا۔ ایک اِس سے بھی زیادہ ظالمانہ رسم بیٹیوں کو زندہ دفن کر دینے کی تھی۔

یہ تھیں چند عادات اور رسوم جو زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں عام تھیں۔ تاہم طلوعِ اسلام کے ساتھ معاشرے کا نقشہ ہی بدل گیا۔ لوگوں نے قبولِ اسلام کے نتیجے میں پسندیدہ عادات اپنالیں۔ شرک کی جگہ توحید نے، جہالت کی علم نے اور نااتّفاقی کی جگہ ہمدردی نے لے لی۔ وہ ایک واحد قوم اور دنیا میں تہذیب و تمدّن کے علمبردار بن گئے۔ اِس سلسلے میں معروف ولندیزی مصنّف ڈوزی (Dozy) یوں رقمطراز ہے:

"اسلام نے عرب قبائل کو متّحد کر کے ایک قومِ واحد بنا دیا جس کا ایک مشترکہ مقصد تھا۔ چنانچہ اِس دین کے ظہور کے بعد مسلمان ایک ایسی مملکت کے مالک بن گئے جو اسپین میں ٹیگس سے لے کر ہندوستان میں گنگا تک پھیلی ہوئی تھی اور انھوں نے دُنیا کے وسیع علاقوں میں تہذیب و تمدّن کا پرچم بلند کر دیا۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب یورپ ازمنۂ وسطیٰ کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔

ان تمام کامیابیوں کا حصول قرآن مجید کی تعلیمات کی بدولت ہی ہوا جو دوسری تمام الہامی کتابوں سے برتر اور افضل تھی۔ قُرآن مجید کی تعلیمات بالکل واضح اور عین مطابقِ عقل ہیں۔ وہ عادلانہ اور متوازن ہیں اور عقلِ سلیم سے مطابقت رکھتی ہیں۔ قرآن مجید کے پہلے سورے (سورۂ حمد) میں ہی انسان کو سکھایا گیا ہے کہ اُسے اللہ تعالیٰ سے گزارش کرنی چاہیئے کہ "اے پروردگار! ہمیں سیدھا راستہ دکھا" یہ جملہ مختصر ہونے کے باوجود بہت بڑی اہمیّت کا حامل ہے۔

قُرآن مجید نے عدل و انصاف پر بے حد زور دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے:

"(اے ایمان والو!) اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کی امانتیں اُن کے حوالے کر دو اور جب لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔" (سورۂ النساء۔ آیت ۵۸)

"اور تمھیں کسی قبیلے کی عداوت اِس جُرم میں نہ پھنسوا دے کہ تم ناانصافی کرنے لگو بلکہ تم (ہر حال میں) انصاف کرو۔ یہی پرہیزگاری سے بہت قریب ہے۔" (سورۂ المائدہ۔ آیت ۸)

"اس میں شک نہیں کہ اللہ انصاف کرنے اور (لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے اور قرابت داروں کو (کچھ) دینے کا حکم کرتا ہے اور بدکاری اور ناشائستہ حرکتوں اور سرکشی کرنے سے منع کرتا ہے اور تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔" (سورۂ النحل۔ آیت ۹۰)

قرآن مجید نے کنجوسی اور فضول خرچی دونوں کے خلاف لوگوں کو خبردار کیا ہے :

"اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے باندھ لو (کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں) اور نہ بالکل کھول دو (کہ سب کچھ دے ڈالو) اور آخر تمھیں ملامت زدہ حسرت ناک بیٹھنا پڑے۔" (سورۂ بنی اسرائیل - آیت ۲۹)

قرآن مجید صبر کی تلقین ان الفاظ میں فرماتا ہے :

"صبر کرنے والوں کو ان کا بھرپور بے حساب بدلہ دیا جائے گا۔" (سورۂ الزمر۔ آیت ۱۰)

"اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۴۶)

تاہم وہ مظلوموں سے یہ بھی نہیں کہتا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ اس کے برعکس اُس نے اُنھیں انصاف کے حصول کی خاطر اور لاقانونیت کو روکنے کی غرض سے بدلہ لینے کی اجازت دی ہے :

"پس جو شخص تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی اُس نے تم پر کی ہے ویسی ہی زیادتی تم بھی اُس پر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب سمجھ لو کہ اللہ پرہیزگاروں کا ساتھی ہے۔" (سورہ البقرہ آیت ۱۹۴)

عدل وانصاف، راستبازی اور میانہ روی کا حکم دے کر قرآن مجید نے ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالی ہے جو اس دُنیا میں بھی اور آخرت

میں بھی بنی نوع انسان کی کامیابی کی ضمانت دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ:

"اور جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرے اللہ اُس کو آخرت میں ایسے (ہرے بھرے) باغوں میں پہنچا دے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور وہ اُن میں ہمیشہ (چین سے) رہیں گے اور یہی تو بڑی کامیابی ہے۔" (سورۃ النساء۔ آیت ۱۳)

"جس شخص نے ذرّہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اُسے دیکھ لے گا اور جس شخص نے ذرّہ برابر بدی کی ہو گی وہ اُسے دیکھ لے گا۔"

(سورۃ الزلزال۔ آیات ۷ و ۸)

"اور جو کچھ اللہ نے تجھے دے رکھا ہے اُس میں آخرت کے گھر کی بھی جستجو کر اور دنیا سے جس قدر تیرا حصّہ ہے (اُسے بھی) مت بھول جا۔" (سورۃ القصص۔ آیت ۷۷)

قرآن مجید کی بہت سی آیات لوگوں کو علم حاصل کرنے اور پرہیز اختیار کرنے کی تلقین کرتی ہیں تاہم قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مستفید ہونے کی عام اجازت دیتا ہے:

"(اے رسولؐ! ان سے) پوچھو کہ جو زینت (کے سازوسامان) اور کھانے کی (صاف ستھری) چیزیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں وہ کس نے حرام کر دیں۔" (سورۃ الاعراف۔ آیت ۳۲)

قرآن مجید انسانوں کے باہمی تعلّقات اور روابط کو بھی نظر انداز نہیں کرتا:

"اے ایمان والو! اپنے وعدوں کو پورا کرو۔" (سورۃ المائدہ۔ آیت ۱)

قرآن مجید انسان کو اپنے والدین، بیوی بچوں، دوسرے اعزّا و اقربا، مسلمان بہن بھائیوں اور تمام بنی نوع انسان سے حُسنِ سلوک کی تاکید کرتا ہے:۔

"اور اُن سے (اپنی بیویوں سے) مہربانی کا سلوک کرو۔"

(سورۂ النساء۔ آیت ۱۹)

"اور اُن کے (عورتوں کے) اُن پر (مَردوں پر)، اُنہی کے مانند حقوق ہیں۔"

(سورۂ البقرہ۔ آیت ۲۲۸)

مندرجہ بالا آیات قرآن مجید کی ان تعلیمات کا نمونہ ہیں جن میں اُس نے مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے۔ اِس حکم نے اسلام کو پھیلنے میں مدد دی اور اس میں زندگی اور قوت کی رُوح پھونک دی۔ اسلام نے ایک دوسرے کو نیکی کی تلقین کرنا اور برائیوں سے روکنا ہر مسلمان کا وظیفہ قرار دیا ہے۔ سب مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی تعلیمات کو عام کریں اور اِس امر کی کوشش کریں کہ اُن پر کماحقّہٗ عملدرآمد ہو۔

اِسلام کی ارفع ترین تعلیمات میں سے ایک کا تعلّق مسلمانوں کی یک جہتی اور مختلف طبقوں کے مابین بھائی چارے سے ہے۔ اسلام علم اور تقویٰ پر مبنی فضیلت کے علاوہ مسلمانوں کے مابین اور کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا:

"اس میں شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک تم سب میں زیادہ عزّت والا وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔"

(سورۂ الحجرات۔ آیت ۱۳)

"(اے رسولؐ!) تم پوچھو تو کہ بھلا کہیں جاننے والے اور نہ جاننے والے لوگ برابر ہو سکتے ہیں؟" (سورۂ الزمر۔ آیت ۹)

رسولِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

"اسلام نے اُن لوگوں کو عزّت بخشی ہے جو زمانۂ جاہلیت میں حقیر خیال کیے جاتے تھے۔ اِس نے ظہورِ اسلام سے قبل کے نسلی تفاخرات کو ملیامیٹ کر دیا ہے۔ اب ان کی نسل اور رنگ سے قطع نظر سب انسان برابر ہیں۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی نظروں میں سب سے زیادہ عزیز شخص وہ ہوگا جو سب سے زیادہ پرہیزگار اور احکامِ دین کا ماننے والا ہوگا۔"

سلمان الفارسی کے ایمانِ محکم کی بنا پر اسلام نے اُنھیں دوسرے صحابہ پر فوقیت بخشی اور وہ رسولِ اکرمؐ کے اہلِ بیت میں سے قرار دیے گئے اور ایمان سے عاری ہونے کی بنا پر آنحضرتؐ کا اپنا چچا ابولہب راندۂ درگاہ ہو گیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اُس زمانے کے رواج کے برعکس آنحضرتؐ نے کبھی بھی اپنے عالی نسب پر فخر نہیں کیا۔ اس کی بجائے آپ نے لوگوں کو اللہ اور یومِ قیامت پر ایمان لانے اور دینِ اسلام اختیار کرنے کی ہدایت کی۔ آپ اُن لوگوں کو راہِ راست پر لے آئے جنھیں نزاع نے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا تھا اور جو ایک دوسرے کے خلاف اپنی نسلی برتری کی شیخی بگھارنے کے عادی تھے۔ آپ نے اُن کے دلوں سے نسلی غرور کو یوں دھو ڈالا کہ ایک عالی نسب امیر شخص اپنی بیٹی کا رشتہ ایک غریب اور مقابلتہً گھٹیا خاندان کے فرد کو دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا۔ اسلام کی تعلیمات فرد اور معاشرے دونوں کے حقوق کی رعایت کرتی ہیں

قرآن مجید نے ایسے قوانین مرتّب کیے ہیں جو دُنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کے ضامن ہیں۔ اگر یہ حقیقت ذہن میں رکھی جائے کہ رسولِ اکرمؐ نے ایک ایسے جاہل معاشرے میں جنم لیا جسے ان قوانین سے دُور کا واسطہ بھی نہ تھا تو آپ کی نبوّت کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

قرآنی افکار کی کاملیت

قرآنِ حکیم نے بہت سے مختلف النوع موضوعات سے بحث کی ہے جن میں دینیات، تواریخ، اقتصادیات، اخلاقیات، الٰہیات، فلکیات، عائلی قوانین، معاشرتی نظام اور تعزیری قوانین وغیرہ شامل ہیں۔ اس مقدّس کتاب نے ہر موضوع پر جو کچھ کہا ہے وہ ناقابلِ تردید اور ہر قسم کی تنقید سے بالاتر ہے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے انجام دینا انسان کے بس کی بات نہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کوئی مفکّر جن آراء کا اظہار کرے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی خامیاں اُجاگر ہو جاتی ہیں اور مزید تحقیق سابقہ افکار کی نفی کر دیتی ہے۔ یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ قدیم فلسفیوں بلکہ جدید تر حکماء کے خیالات کو اُن کے بعد آنے والے دانشوروں نے موردِ تنقید بنایا ہے۔ اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جن چیزوں کو ایک زمانے میں ناقابلِ تردید حقیقت مانا جاتا ہے وہ بعد میں من گھڑت اور بناوٹی ثابت ہوتی ہیں۔ تاہم ایک مدّتِ مدید گزرنے کے باوجود آج تک قرآن مجید کا کوئی ارشاد بھی باطل ثابت نہیں ہو سکا۔

قرآن مجید کی پیش گوئیاں

قرآن مجید کی متعدّد آیات میں آئندہ رُونما ہونے والے چند اہم واقعات کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پیش گوئیاں کرنا وحیٔ الٰہی کے بغیر ممکن نہ تھا۔

جن واقعات کی پیش گوئی قرآن مجید نے فرمائی ہے اُن میں غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی فتح، رومیوں کی فتح (جنھوں نے پہلے ایرانیوں کے ہاتھوں ذلّت آمیز شکست کھائی تھی) اور ابولہب کی ایک مشرک کی حیثیت سے موت شامل ہیں۔

اسرارِ فطرت

قرآن مجید نے کئی ایک ایسے قوانینِ فطرت اور علمی حقائق پر سے پردہ اُٹھایا جن کا ظہورِ اسلام کے وقت معلوم ہونا وحی کے بغیر ناممکن تھا۔ گو اِن میں سے کچھ قوانین اور اصول قدیم یونانیوں کو معلوم تھے لیکن جزیرہ نمائے عرب میں اِن کے متعلّق کوئی کچھ نہیں جانتا تھا اِن کے علاوہ کچھ قوانین ایسے بھی تھے جو علم کی پیش رفت کی بدولت صدیوں بعد منکشف ہوئے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں صریحًا یا اشارتًا قوانینِ فطرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ کچھ علمی حقائق لوگوں کے لیے ناقابلِ فہم تھے اس لیے اُن کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا گیا جن کی تعبیر بعد میں آنے والی نسلوں نے کی۔

ذیل میں چند مثالیں دی جاتی ہیں:

"اور ہم نے اِس میں (زمین میں) ہر قسم کی وزن والی چیز اُگائی"
(سورۃ الحجر - آیت ۱۹)

اِس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ ہر اُگنے والی چیز کا ایک مخصوص وزن ہوتا ہے اور اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ نباتات کی دنیا میں ہر چیز مقررہ مقدار میں چند کیمیائی عناصر سے مل کر بنتی ہے اور اگر اس تناسب میں خلل واقع ہو جائے تو وہ کوئی اور چیز بن جائے گی۔

"اور ہم نے بھرنے والی ہوائیں بھیجیں" (سورۃ الحجر - آیت ۲۲)

یہ آیت پودوں اور درختوں کی ہوا سے زیرگی کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ سائنسی طور پر اس حقیقت کا انکشاف قرآن مجید کے مندرجہ بالا اظہار سے صدیوں بعد ہوا۔

"اور اُس نے تمام پھل جوڑوں میں بنائے ہیں" (سورۃ الرعد - آیت ۳)

"(ہر عیب سے) پاک صاف ہے وہ ذات جس نے زمین سے اُگنے والی چیزوں کے اور خود اُن کے اور اُن چیزوں کے جن کی اُنھیں خبر نہیں جوڑے پیدا کیے" (سورۃ یٰسین - آیت ۳۶)

اِن آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جانوروں کی طرح پودوں اور پھولوں میں بھی ذکور اور اناث ہوتے ہیں اور پودوں کی بناوٹ جانوروں کی جنس (مذکر اور مونث) سے مشابہ ہے۔

"تمھارا معبود یقیناً ایک ہی ہے جو سارے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے (سب کا) پروردگار ہے اور (چاند، سورج، ستارے کے) طلوع (اور غروب) کے مقامات کا بھی مالک ہے" (سورۃ الصّٰفّٰت - آیت (۵)

"میں مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم کھاتا ہوں کہ ہم ضرور اس بات کی قدرت رکھتے ہیں ......"

(سورۃ المعارج - آیت ۴۰)

ان آیات میں مناطق کے وقت کا ذکر ہے اور زمین کے مدوّر ہونے کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

ائمہّ علیہم السّلام کے اقوال سے بھی پتا چلتا ہے کہ زمین ایک کرّہ ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السّلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

"ایک شخص مجھ سے ملنے آیا۔ وہ مغرب کی نماز شام کے وقت اور فجر کی نماز پو پھٹنے سے پہلے پڑھتا تھا۔ اِس کے برعکس میں مغرب کی نماز سورج ڈوب جانے کے بعد اور فجر کی نماز پہلا سپیدۂ صبح نمودار ہونے پر پڑھتا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ یہ نمازیں اس وقت کیوں نہیں پڑھتے جس وقت میں پڑھتا ہوں اور مزید کہا کہ سورج بعض مقامات پر ہمارے ملک سے پہلے نکل آتا ہے اور بعض جگہوں پر اس وقت ڈوب جاتا ہے جب ہمارے مُلک میں ابھی افق سے بلند تر ہی ہوتا ہے۔ میں نے اُسے جواب دیا کہ نماز ہمارے علاقے میں سورج غروب ہو جانے کے بعد اور سحر نمودار ہونے کے بعد ہی پڑھنی چاہیئے۔" (الوسائل - جلد اوّل)

اُس شخص نے دلیل پیش کی تھی کہ سورج مختلف منطقوں میں مختلف اوقات پر طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ امام علیہ السّلام نے اُس کی اِس بات سے اتّفاق کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ اُسے اُس کا مذہبی فریضہ بھی یاد دلایا۔

ہم نے قرآن مجید کے بے مثل ہونے کے صرف چند پہلوؤں کا ذکر کیا ہے تاہم ان سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ الہامی کتاب ہے اور اِس

کی مثال پیش کرنا انسان کی قدرت سے باہر ہے۔

قرآن مجید کو کلام اللہ ثابت کرنے کے لیے اتنا کہنا کافی ہے کہ امام علی علیہ السّلام فقط اِسی مکتب کے فارغ التحصیل تھے۔ آپ کے خطبات کا مجموعہ "نہج البلاغہ" ہمارے پاس موجود ہے۔ جب آپ کسی موضوع پر اظہارِ خیال فرماتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کہ آپ نے اپنی تمام عمر اِسی موضوع کے مطالعے میں صَرف کی ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ آپ نے اپنا تمام تر عِلم کتاب اللہ سے ہی حاصل کیا تھا۔ جو شخص عرب اور بالخصوص حجاز کی تاریخ سے واقف ہو وہ یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ امام علیؑ کے عِلم وفضل کا ماخذ وحیٔ الٰہی کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہو سکتی ہے۔

دعوتِ اسلام

تمام الہامی مذاہب کی طرح اسلام نے بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار اور اس کے علاوہ کسی شخص یا چیز کی پرستش کے خلاف مبارزہ کی دعوت دی۔ اسلام ذاتِ باری تعالیٰ کی وحدانیت پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔ جب کوئی غیر مُسلم اسلام قبول کرتا ہے تو سب سے پہلا جُملہ جو اُسے ادا کرنا ہوتا ہے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه ہی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں)۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کی توحید اور حضرت محمدؐ کی رسالت کا اقرار کر لے وہ کسی مزید رسمی کارروائی کے بغیر دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔

اسلام اتّحاد بین المسلمین کو بڑی اہمیّت دیتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ

مسلمانوں کو عدل، احکامِ الٰہی کی تعمیل، زہد و تقویٰ، صفائی، نامناسب امتیاز سے اجتناب، محنت اور حصولِ علم کی تلقین کرتا ہے۔ مزید برآں وہ انھیں عقل و ہوش سے کام لینے اور نااتفاقی اور باہمی اختلاف سے بچنے کو کہتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

"میں تمھیں یہ واحد نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ کی خاطر جوڑوں میں (یعنی مل کر) یا اکیلے کھڑے ہوجاؤ اور پھر غور کرو۔"

اسلام دین کے معاملے میں جبر کو جائز نہیں سمجھتا۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس مقدّس دین کو آزادانہ طور پر اور منطق اور عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول کریں کیونکہ عقیدہ کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی شخص پر زبردستی ٹھونس دیا جائے۔

"دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ صیحح راستے کو غلط راستے سے ممیّز کر دیا گیا ہے۔"

اسلام آخری الہامی مذہب ہے

جس طرح انسان کو عام تعلیمی زندگی میں اپنی تعلیم کی تکمیل سے پہلے کئی مراحل مثلاً پرائمری اسکول، مڈل اسکول، ہائی اسکول وغیرہ سے گزرنا پڑتا ہے کچھ ایسی ہی صورت مذہبی تعلیمات کی بھی ہے۔ چنانچہ مذہب کے بارے میں انسانیت کئی مراحل سے گزر کر بالآخر اپنی آخری منزل پر پہنچ گئی جس کا نام اسلام ہے۔

اسلامی اصول انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہیں:

انسانی فطرت ہر جگہ اور ہر زمانے میں تقریباً ایک جیسی رہی ہے۔

چنانچہ لوگ سفید ہوں یا سیاہ، عرب ہوں یا غیر عرب، مرد ہوں یا عورتیں، بوڑھے ہوں یا جوان، امیر ہوں یا غریب، کمزور ہوں یا طاقت ور، عقل مند ہوں یا نادان، انسانیت سب میں قدرِ مشترک ہے۔ وہ کچھ بھی ہوں ان کی فطرت ایک جیسی ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اُن کا تعلّق پتّھر کے زمانے سے تھا یا موجودہ خلائی دَور سے ہے۔ "تاریخِ فلسفۂ سیاسیات" (History of Political Philosophy) کا مؤلف اس سلسلے میں یوں اظہارِ خیال کرتا ہے:

"عادات اور رسوم و رواج ایسے لبادے ہیں جنھوں نے ہمارے ایک ٹھوس حقیقت کی مانند تغیّر ناپذیر بدن کو ڈھانپ رکھا ہے۔ یہ لبادے ہر ملک اور ہر معاشرے میں کسی نہ کسی رنگ اور روپ میں موجود ہیں، اگرچہ بنیادی طور پر انسانی فطرت ایک جیسی ہے اور اس کے کچھ مخصوص اصول ہیں۔ اس کی وسعت کا یہ عالَم ہے کہ نفسیات (جو انسانی فطرت کا مطالعہ کرتی ہے) کا دائرۂ کار تغیّر ناپذیر انسانی فطرت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ لٰہذا جب تک انسان باقی ہے اور انسان کا تسمیہ اپنائے ہوئے ہے اُس کی یہ فطرت بھی باقی رہے گی اور اِس میں کوئی تغیّر و تبدّل بھی وقوع پذیر نہ ہوگا۔"

انسان کی ذاتی اور فطری ضروریات

انسان کی ضروریات دو قسم کی ہیں۔ ان میں سے کچھ بُنیادی اور کچھ ثانوی ضروریات کہلاتی ہیں۔ یہاں ہم جن ضرورتوں سے بحث کر رہے ہیں وہ اس کی بنیادی ضرورتیں ہیں۔ یہ ضرورتیں انسان کی جسمانی اور رُوحانی

ساخت اور اجتماعی فطرت سے جنم لیتی ہیں اور انسان کی حیثیت سے وہ ان کا محکوم ہے۔

عمرانیات نے اس امر کی جانب بھی توجّہ مبذول کرائی ہے کہ مختلف معاشروں میں کئی باتیں مشترک ہیں اور یہ چیز فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔اس بنا پر ہم ان مشترک باتوں کو عام قاعدے کے تحت لا سکتے ہیں۔

اس بات کو مدّنظر رکھتے ہوئے کہ بنی نوع انسان اپنی ساخت کے اعتبار سے یکساں ہیں اور ان کے خواصِ انسانیت میں بھی ہم آہنگی پائی جاتی ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بلاشبہ ان کی ضروریات بھی ایک نوعیت کی ہوں گی اور ان کے لیے ایک جیسے قوانین کا کارفرما ہونا لازم ہوگا۔مثلاً کسی قوم کے لیے کسی وقت یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک ایسے دشمن کے خلاف برسرِپیکار نہ ہو جو اسے نیست و نابود کرنے کے درپے ہو اور بالخصوص جب جنگ وجدل کے علاوہ اس خطرے کو دُور کرنے کا اور کوئی ذریعہ بھی نہ ہو۔ایسی صورت میں جو قوم خطرات سے دوچار ہو اس کا خون خرابے کو ناجائز قرار دینا ممکن نہیں۔

اسی طرح افراد کی جان کی حفاظت ہر معاشرے کی ذمّے داری ہے اور کوئی معاشرہ اس سے پہلوتہی نہیں کرسکتا۔نہ ہی کوئی معاشرہ اپنے لوگوں کی جنسی زندگی پر کوئی پابندی عائد کرسکتا ہے۔ان کے علاوہ اور بھی بےشمار مثالیں دی جاسکتی ہیں جن سے ہر زمانے اور ہر دَور میں فطرتِ انسانی کے تغیّر ناپذیر ہونے کا پتا چلتا ہے۔

یہ فطری میلانات ہیں جو انسان میں اس کی پیدائش کے وقت سے ہی پوشیدہ ہوتے ہیں۔یہ منظرِ عام پر اس وقت آتے ہیں جب انسان نشوونما پاتا ہے یا جب اُن کے راستے میں حائل رکاوٹیں دُور ہو جاتی ہیں۔

یہ نئی ضروریات کو جنم دیتے ہیں اور بالآخر انسانی تمدّن کی ترقی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ تاہم کسی تمدّن میں کوئی عامل اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ ہم اپنی بنیادی ضرورتوں کو پسِ پُشت ڈال دیں۔ مثال کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اپنی تہذیب و تمدّن کی بدولت ہم بہتر غذا، زیادہ قیمتی لباس اور زیادہ آرام دہ اور خوشگوار زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ کہنا ممکن نہیں کہ ہماری کھانے پینے سونے اور زندگی بسر کرنے کی ضروریات تہذیب کی مرہونِ منّت ہیں۔ نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ تہذیب کے متشکّل ہونے سے پہلے ان ضروریات کا کوئی وجود نہ تھا۔ بلاشبہ ان ضروریات کا تعلّق خود ہماری ہستی سے ہے۔

انسانی فطرت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ جب عادات کا ایک معیّن اور قطعی معمول مرتّب ہو جائے تو پھر کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہیئے جس سے ان عادات میں تغیّر پیدا ہو۔

انسان کی یہی فطرت ہے جو اسلامی اصولوں کی توجّہ کا مرکز ہے۔ چونکہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو کسی مخصوص گروہ یا قوم کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے نازل کیا گیا ہے لہٰذا اس کا ضابطۂ اخلاق مرتّب کرتے ہوئے اس انسانی فطرت کا بطور خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اسلامی اصول وضع کرتے ہوئے انسان کی بنیادی ضروریات کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے اور چونکہ انسانی فطرت بنیادی طور پر تغیّر ناپذیر ہے لہٰذا اسلام نے بھی زندگی کے قوانین کا ایک ایسا ضابطہ مرتّب کیا ہے جس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قوانین بغیر کسی کمی بیشی کے مدّتِ مدید سے بہت سے ممالک میں نافذ ہیں۔

اسلامی احکام اِس انداز سے وضع کیے گئے ہیں کہ وہ تخلیقِ انسانی سے مطابقت رکھتے ہوں اور انسان کے میلانات اور اوصاف سے ہم آہنگ ہوں۔

"اپنا رُخ پائدار مذہب کی جانب پھیر لو"۔ یہ پائدار مذہب فطرتِ الٰہی ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ تخلیق کے بارے میں سُنّتِ الٰہی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور یہی سُنّتِ الٰہی ہے جس نے انسان کو اپنے احاطے میں لے رکھا ہے۔ لہٰذا جب تک انسان، انسان رہے گا اس کی فطرت بھی یہی رہے گی اور ماضی، حال یا مستقبل اس پر اثر انداز نہیں ہوں گے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ انسانی طبیعت کی اُفتاد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت بدل گئی ہے اور اس کی جگہ کسی اور چیز نے لے لی ہے۔

اسلامی تعلیمات کی بنیاد فطرت پر ہے۔ یہ وہی فطرت ہے جو حکمِ الٰہی سے وجود میں آئی ہے اور چونکہ یہ فرمانِ خداوندی کے مطابق ہے اس لیے اس میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی۔ پس مذہب سے انسان کی یہی تغیّر ناپذیر فطرت مراد ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس سے واضح ہے کہ اس انسانی فطرت کے لیے ایک مستقل اور پائدار اصولوں کا نظام اشد ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی دعوت میں اسلام نے اس سے مستزاد کچھ نہیں کہا۔ لہٰذا اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق فطرتِ انسانی پر صرف ایسے اصولوں کا اطلاق کیا جا سکتا ہے جو لوگوں کے لیے بالعموم اور بالخصوص قابلِ عمل ہوں۔ اِن ابدی

اصولوں کے مطابق ازمنۂ قدیم کے انسان کی سیدھی سادی زندگی اور موجودہ ترقی یافتہ دَور کے پیچیدہ طرزِ تمدّن رکھنے والے انسان کی زندگی میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں کیونکہ ان کی اصلی اور جبلّی فطرت ایک ہی ہے اور نہ ہی زندگی بسر کرنے کے مختلف انداز انسان کی تغیرّ ناپذیر فطرت پر کوئی اثر ڈال سکتے ہیں لہٰذا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ ایسی گاڑیوں میں سفر کرتا ہے جسے جانور کھینچتے ہوں یا جیٹ ہوائی جہازوں یا ایٹمی آبدوزوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے یا وہ غاروں میں رہتا ہے اور گھاس پات اور پھل پھول کھا کر گزارہ کرتا ہے یا عالی شان محلوں میں سکونت پذیر ہوتا ہے اور اس کے دسترخوان پر انواع واقسام کے پُر تکلّف اور لذیذ کھانے چُنے جاتے ہیں اور اس کا بستر مخمل اور کمخواب کا ہوتا ہے ۔ ان تمام صورتوں میں اس کی بنیادی فطرت وہی رہتی ہے ۔

زندگی گزارنے کے یہ طور طریقے قطعاً عارضی ہیں اور مذہبی نقطۂ نگاہ سے ان کی کوئی اہمیّت نہیں ہے ۔ اصل مقصد انسان کی تربیت ہے ۔ بہ الفاظ دیگر مذہب کا مطمحِ نظر انسان کی صلاحیتوں کا خیال رکھتے ہوئے اس کی ان بنیادی فطری رجحانات کا ارتقا ہے جو انسان کو ودیعت کیے گئے ہیں درحقیقت اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام ان فطری رجحانات اور میلانات کا دوسرا نام ہے جو انسان کے اندر پوشیدہ ہیں ۔ لہٰذا اسلام انسانی ارتقا کے بلند ترین معیار پر پورا اُترتا ہے اور جب تک انسان اِس کرۂ ارض پر موجود ہے اُس وقت تک اِس دینِ متین کے قوانین اور احکام زندہ و پائندہ رہیں گے اور امتدادِ زمانہ سے فرسودہ نہیں ہوں گے ۔

اسلامی اصولوں کا مبنی بر حقیقت ہونا

موجودہ دَور میں قانون وضع کرتے وقت قانون سازی کی بنیادی خصوصیات کو مدِّنظر نہیں رکھّا جاتا۔ لہٰذا ممکن ہے کہ ایک ایسا قانون وضع کر لیا جائے جو محض جزوی طور پر مفید ہو لیکن کلّی طور پر مضرّت رساں ہو گو وقتی طور پر اُس کے مضر اثرات نظر سے پوشیدہ ہوں۔ مثلاً شراب نوشی ایک مذموم عادت ہے اور اس کے مضر نتائج کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وجودِ انسانی کے لیے ایک عظیم خطرہ ہے۔ تاہم چونکہ اس سے ٹیکس وغیرہ کی صورت میں حکومت کو مالی فوائد حاصل ہوتے ہیں اس لیے بعض حکومتیں اِسے برقرار رکھنا جائز سمجھتی ہیں۔ یہی صورت قمار بازی اور قحبہ خانوں کی ہے۔

تاہم اسلامی قوانین چونکہ خالقِ ارض وسماوات کی جانب سے نازل ہوئے ہیں اس لیے اپنی ترکیب میں ان دُنیاوی قوانین سے قطعاً مختلف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا کیا ہے اور وہ اس کے ظاہر و باطن سے بخوبی واقف ہے۔ جہاں تک اس کے لامحدود علم کا تعلّق ہے ماضی اور مستقبل میں کوئی فرق نہیں چونکہ خود اُس نے فطرت کی تخلیق کی ہے اس لیے اس کا علم فطرت سے مکمّل طور پر ہم آہنگ ہے۔ اسلام انسانی فطرت کو اُس اصلی شکل میں پیشِ نظر رکھتا ہے جس میں خالقِ کائنات نے اسے تخلیق کیا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ اسلامی قوانین وضع کرتے وقت انسانی ضروریات کا خیال رکھّا گیا تھا اُسی طرح اسلام ہر مرحلے پر انسانی خواہشات اور میلانات کو ملحوظِ خاطر رکھتا ہے۔

اسلامی احکام کے موضوعات کا انتخاب کرتے وقت بھی انسانی فطرت کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور یہ امر واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ احکام اس اصول کے تابع ہیں کہ آیا کوئی چیز انسان کے لیے مفید ہے یا مضرت رساں ہے۔ یہ کسوٹی اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ انسانی فطرت اور اسلامی تعلیمات میں مکمّل ہم آہنگی ہے اور جن مسائل کے بارے میں احکام دیے گئے ہیں جب تک وہ مسائل موجود رہیں گے ان احکام کی بنیادی خصوصیات بھی برقرار رہیں گی۔ پس مختلف اشیا کی خصوصیات کی تغیّر ناپذیر ماہیّت کا انعکاس اسلامی قوانین کے ناقابل تغیّر مزاج میں بھی ہوتا ہے اور اس بنیاد پر جو قوانین وضع کیے گئے ہیں وہ اس وقت تک موجود رہیں گے جب تک یہ بنیاد قائم رہے گی۔ چنانچہ کسی چیز کے مفید یا مضر ہونے کے ساتھ اسلامی اصولوں کا تعلّق ان اصولوں کو ابدیت بخشتا ہے۔

مثلاً اسلام ایک کاذب شخص کو اللہ تعالیٰ کا دشمن گردانتا ہے اور اُس کی اِس بدخصلت کے جو مضر اثرات مرتّب ہوتے ہیں انھیں خیانت قرار دیتا ہے۔ اب کیا یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ جھوٹ آج سے چودہ سو سال پہلے تو خیانت تھا لیکن عِلم و دانش کے موجودہ دَور میں یہ خیانت نہیں رہا؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔

اسی طرح اسلام نے شراب نوشی کو قطعاً حرام قرار دیا ہے۔ قرآن مجید اسے گناہ اور شیطانی کام تصوّر کرتا ہے۔ آنحضرتؐ کے ارشاد کے مطابق شراب اُمّ الخبائث اور گناہوں کا منبع ہے۔ آپ نے شرابیوں کو ملعون کہا ہے شراب کا صرف ایک گھونٹ پینے کی سزا اسّی دُرّے ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اسلام نے شراب کو اس کے تباہ کُن اثرات کی بِنا پر حرام قرار دیا ہے۔

یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جب تک منشیات دُنیا میں موجود رہیں گی ان کی خرابیاں بھی ان کے ساتھ ساتھ موجود رہیں گی لہٰذا کیا یہ کہنا کھلی حماقت نہیں ہوگی کہ شراب آج سے چودہ سو سال پہلے تو ایک مضر چیز تھی لیکن موجودہ خلائی دَور میں یہ مضر نہیں رہی ؟ تاریخِ انسانی کا کوئی سال ایسا نہیں گزرتا جس میں اِس اُمّ الخبائث کے استعمال کے براہِ راست نتیجے کے طور پر قتل، خودکشی، غبن، ڈاکہ زنی، فحش حرکات اور زنا وغیرہ کی سینکڑوں وارداتیں نہ ہوتی ہوں۔ پس کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ منشیات کی اس متروک ممانعت کو دوبارہ نافذ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ؟ جو قانون فطرت کی زبان میں گفتگو کرتا ہو وہ کبھی متروک یا فرسودہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سچّائی اور حقیقت کے نیا یا پرانا ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جو ہر جگہ اور ہر مقام پر تازہ بتازہ نو بنو رہتی ہے۔

اسلام نے زنا، فحاشی، جنسی بے راہ روی اور لاقانونیت کی پُرزور مذمّت کی ہے۔ لوگوں کے ناموس کی حفاظت کی خاطر اس نے تاریخِ قانون میں پہلی مرتبہ یہ حکم دیا کہ جو مرد اور عورت جنسی بے راہ روی کے مرتکب ہوں اُنھیں سَو سَو دُرّے لگائے جائیں۔ اس غیر اخلاقی فعل کی تلافی کی خاطر اس نے یہ بھی قانوناً لازمی قرار دیا ہے کہ جب مجرموں کو دُرّے لگائے جائیں تو عامّۃ النّاس موقع پر موجود ہوں۔

کیا کوئی ذی ہوش انسان یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ یہ قوانین ایک پسماندہ معاشرے کے لیے وضع کیے گئے تھے اور اب پُرانے ہو گئے ہیں یا یہ کہ زمانۂ گزشتہ میں تو ان پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنا ممکن تھا

لیکن خود مختاری اور جنسی آزادی کے موجودہ دَور میں فرسودہ اور بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں؟ جب ہم دیارِ مغرب کے حالات پر نگاہ ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اُس نے کیونکر اپنی جاذبیت کھو دی ہے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ قوانین نہ تو فرسودہ ہوئے ہیں اور نہ ہی کبھی آئندہ ان کے غیر مؤثّر ہونے کا امکان ہے۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ اسلام نے اگر بعض چیزوں کے جائز اور بعض کے ناجائز ہونے کے بارے میں حکم دیا ہے تو ان کی افادیت اور مصلحت کو مدّنظر رکھتے ہوئے دیا ہے۔ ہر حکم کا ایک مخصوص مقصد ہے جس چیز کو اسلام نے جائز کہا ہے وہ انسان کے لیے مفید ہے اور جس چیز کو اس نے ناجائز قرار دیا ہے وہ کسی نہ کسی وجہ سے انسان کے لیے مضر ہے۔ خواہ یہ مضرت مادّی لحاظ سے ہو یا اخلاقی نقطۂ نظر سے ہو۔ انسان چیزوں کی حقیقت سے کما حقّہ واقف نہیں ہے۔ تاہم ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب وہ اپنے علم اور تجربے کی بنا پر اُن کے حُسن و قبُح کا ادراک کر سکے گا۔

برطانوی دانشور مسٹر ویلز (Mr. Wells) نے یہ کہہ کر کتنے مبنی بر انصاف خیالات کا اظہار کیا ہے کہ:

"جہاں تک مجھے علم ہے اور جیسا کہ میں بارہا کہہ چکا ہوں اسلام اور فقط اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اسرارِ تخلیق اور مظاہرِ قدرت کی حقیقت سے پوری طرح واقف اور تہذیب پر محیط ہے۔"

حقیقت ہمیشہ تروتازہ رہتی ہے

جو چیز مبنی بر حقیقت ہو وہ صرف یہی نہیں کہ تازہ بتازہ رہتی

ہے بلکہ وہ کبھی بھی فرسودہ نہیں ہوتی۔ مثلاً افلاطون اور ارسطو کے نظریات پر نگاہ ڈالیے۔ گو انھیں پیش کیے ہوئے ڈھائی ہزار سال گزر چکے ہیں لیکن وہ ابھی تک تازہ بتازہ ہیں اور ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے۔ گردشِ زمانہ کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان دانشوروں کے زمانے میں بھی دو اور دو مل کر چار بنتے تھے، موجودہ دَور میں بھی چار ہی بنتے ہیں اور دو ہزار سال بعد بھی چار ہی بنیں گے۔ انقلاباتِ دہر اور مرورِ زمانہ کا اس حقیقت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اس حقیقت میں کوئی کلام نہیں کہ اسلام کا ہر اصول ہر لحاظ سے نظامِ تخلیق سے ہم آہنگ ہے۔ ہم ساری دنیا میں کامل طور پر فطری اور حق و صداقت سے پورا پورا وابستہ قانون اسلام کے علاوہ اور کوئی نہیں پاتے۔ اسی قول کو بہتر طور پر یوں دُہرایا جا سکتا ہے کہ اسلام کے اصول اور تعلیمات عینِ فطرت ہیں۔ اگر یہ دینِ فطرت نہ ہوتا تو تغیّراتِ زمانہ کے ہاتھوں کب کا ملیا میٹ ہو گیا ہوتا۔ اس کے برعکس یہ اب بھی بالکل تر و تازہ ہے حالانکہ اسے اپنی بقا کے لیے نہ تو ماضی میں کبھی مادّی سہارے میسّر ہوئے ہیں اور نہ ہی اب میسّر ہیں اور اس کی یہ تازگی اِس امر کے باوجود برقرار ہے کہ ہر دَور میں اِسے مٹانے کی پوری پوری کوششیں کی گئی ہیں اور اب بھی کی جا رہی ہیں۔ اسلام کی بشاشت کا راز اِس بات میں مضمر ہے کہ اس مذہب میں مافوقیت کا رنگ بھی ہے اور اس کی ترقّی کی راہ روشن ہے۔ اِس حقیقت کا ادراک کر کے مغربی دانشور حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ اسلام کی اس پائداری اور ترقّی کی وجہ یہ ہے کہ اس کا دستور فطری ہے اور زندگی کی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہے لہٰذا

جب تک دُنیا باقی ہے اسلامی قانون بھی جاری وساری رہے گا۔

گو اسلام کو دُنیا میں آئے چودہ سو سال گزر چکے ہیں تاہم اُس دینِ متین کی عظمت اور شوکت اس حقیقت سے عیاں ہے کہ جو کچھ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا وہ اب بھی اِتنا ہی صحیح ہے جتنا خود آپ کے زمانے میں تھا اور انسان کی فلاح وبہبود کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ حضورؐ کے لائے ہوئے دستور پر عمل پیرا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا پیغام ہمیشہ کے لیے تازہ اور زندہ ہے اور اس میں ہر دَور کے انسان کے لیے ایک عالی اور ابدی نصب العین موجود ہے۔

صرف اور صرف اسلام سے وابستگی کی بدولت انسان زندگی کے ہنگاموں سے محفوظ رہ کر ترقّی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ فقط اِسی دین کی پیروی کرتے ہوئے انسان اپنی زندگی اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ وسیع کائنات کے مابین ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ امر واضح ہے کہ اسلامی طرزِ زندگی اور انسان کے ارتقا اور تہذیب میں کوئی تصادم رونما نہیں ہو سکتا کیونکہ اسلام انسان کو دینِ خداوندی کی دعوت دیتا ہے اور اُس کے دل میں ایک عالی اور مقدّس مقصد کے حصول کے لیے ذمّے داری اور ذاتی عظمت کا احساس پیدا کرتا ہے۔

اسلامی قوانین کی نوعیت

الہامی مذاہب کے احکام دو قسم کے ہوتے ہیں۔ احکام کی ایک قسم تو وہ ہے جو ابدی اور ناقابلِ تغیّر ہوتے ہیں۔ یہ احکام مرورِ زمانہ سے

کالعدم نہیں ہوجاتے بلکہ انقلاباتِ دہر کے باوجود ایک عالی تر مسلک سے پیوست ہوجاتے ہیں۔

احکام کی دوسری قسم وہ ہوتی ہے جو وقت، جگہ اور حالات سے مخصوص ہوتے ہیں۔ وقت گزرنے پر یہ احکام فرسودہ اور متروک ہوجاتے ہیں اور دوسرے احکام ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یہی احکام ہیں جن کی مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ "پرانی شریعت کالعدم ہوگئی ہے اور اس کی جگہ نئی شریعت نے لے لی ہے۔" منسوخ شدہ احکام کا نفاذ فقط ایک مخصوص وقت اور جگہ میں ہوتا ہے لہٰذا وہ بھی حقیقت کی عکاسی ہی کرتے ہیں گو یہ حقیقت محض جزوی ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک حقیقت دوسری حقیقت کی جگہ لے لے؟ اس بنا پر یہ ضروری نہیں کہ ایک نیا مذہب پرانے مذہب کے تمام احکام کو منسوخ کردے بلکہ الہامی مذاہب میں کئی ایک ایسے احکام ہیں جو پائدار اور تغیّر ناپذیر ہیں اور جن پر عمل پیرا ہونے کی دعوت حضرت آدمؑ سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تک تمام انبیائے کرامؑ نے دی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ایک قانون کی تنسیخ کا جواز خود ایک مذہب کے دستور میں موجود ہو اور ایک ایسا قانون بھی ہوسکتا ہے جو دوسرے قانون کو کالعدم قرار دے دے۔ اسلام میں اس قسم کے قوانین کی مثالیں موجود ہیں اور انھیں ناپائدار اور تبدّل پذیر خیال کیا جاتا ہے۔

انسان کی پائدار اور تغیّر ناپذیر ضروریات کے پیشِ نظر اسلام نے پائدار اور تغیّر ناپذیر قوانین وضع فرمائے ہیں اور اس کی غیر مستقل ضروریات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس نے اپنے طریقِ کار میں تبدیلی

کی پیش گوئی بھی کر دی ہے۔ پس ایک اسلامی معاشرے میں مؤثر قوانین کی دو قسمیں ہوتی ہیں یعنی :

(۱) —— دائمی قوانین

(۲) —— تبدیل پذیر قوانین

پہلی قسم ان قوانین پر محیط ہے جو ایک فطری مذہب کے لیے آنحضرتؐ پر وحی کیے گئے اور جن کے بارے میں یہ طے کر دیا گیا کہ یہ تمام حالات میں بنی نوع انسان کے لیے واجب العمل ہوں گے۔ مثلاً عدل و انصاف، امن، آزادی، صفائی، ایفائے عہد، راستبازی، سچّائی، دیانت داری، خدمتِ خلق، راہِ حق میں جاں نثاری، محبّت، اخلاص، ارشاداتِ الٰہی کی تعمیل، ظلم اور استحصال سے اجتناب، ناجائز جانب داری اور بددیانتی سے مبارزہ اور دسیوں اور اخلاقی اصول اسی زُمرے میں آتے ہیں۔ اسی طرح اسلام ہتکِ عزّت، نزاع، اوباشی، دروغ گوئی اور جعل سازی کی ممانعت کرتا ہے۔ یہ ابدی قدروں کے معاملات ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں خواہ لاکھوں برس ہی کیوں نہ گزر جائیں ظلم کوئی اچھّی چیز نہ بن سکے گا اور عدل و انصاف فعلِ قبیح کی شکل اختیار نہیں کرے گا۔ اسلامی تعلیمات کا اہم حصّہ انہی جاودانی اصولوں سے تعلّق رکھتا ہے جن میں امتدادِ زمانہ سے کوئی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی۔

اس حقیقت کی توضیح ان احادیثِ نبویؐ سے ہوتی ہے کہ جس چیز کو رسولِ اکرمؐ جائز قرار دیں وہ روزِ قیامت تک جائز ہے اور جسے آپ ناجائز کہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناجائز ہے۔ وقت ان قوانین پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ ریاضی کے قطعی ضابطوں کی مانند یہ ہمیشہ قطعی اور

یقینی رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اِن قوانین کو انسان کی ان بُنیادی ضرورتوں کی پشت پناہی حاصل ہے جو اس کی فطرت میں مضمر ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جب تک انسان نے انسانیت کا جامہ زیب تن کر رکھا ہے اس کی فطرت وہی رہے گی اور اس میں کوئی تغیّر رونما نہیں ہو سکتا۔

دوسری قسم کے قوانین وہ ہیں جو زمان اور مکان کی مصلحتوں کو مدِّ نظر رکھ کر وضع کیے گئے ہیں۔ ان قوانین کی اساس اتنی مضبوط اور پائدار نہیں جتنی متذکرہ بالا قوانین کی ہے لہٰذا تہذیب کے ارتقا اور اچّھے بُرے حالات کے اُلٹ پھیر کے مطابق ان میں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ یہ قوانین اپنی بقا کے لیے وقت اور جگہ کے محتاج ہوتے ہیں کیونکہ یہ انسانی ضروریات سے جنم لیتے ہیں اور یہ ضروریات وقت اور جگہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ جن مسائل پر اس قسم کے قوانین اور احکام محیط ہیں ان میں مسلمان ممالک کے غیر مسلموں سے تعلقات اور معاہدات، سیاسی اور اقتصادی روابط، دفاعی تدابیر، دفاعی ضروریات اور ایسے ہی دوسرے معاملات شامل ہیں۔ اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان چیزوں میں تغیّر و تبدّل ہوتا رہتا ہے اور ہر دَور اور زمانے کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ تاہم اس میدان میں بھی اسلام نے ایسے عام اصول مرتّب کیے ہیں جو ہر دَور کے لیے موزوں ہیں اور بدلتے ہوئے حالات کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔

مثلاً دفاعی تیاّریوں اور فوجی ساز و سامان فراہم کرنے کے سلسلے میں قُرآن مجید فرماتا ہے:

"(اے مسلمانو!)، تم ان کے خلاف جتنی فوج اور پلے ہوئے گھوڑے تیّار کر سکتے ہو تیّار کرو تاکہ تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ کر دو۔"

یہ امر قابلِ غور ہے کہ جنگی تیّاریوں کا عام ضابطہ تجویز کرنے کے بعد واضح طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ اِن تیّاریوں کا مقصد جارحیت اور قتل و غارت نہیں بلکہ دشمن کے دل میں خوف پیدا کرنا ہے تاکہ وہ دہشت زدہ ہو کر جنگ کے اقدام سے باز رہے۔

اسلام نے ہر زمانے کی ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جو عام احکام دیے ہیں مذکورہ بالا حکم انہی کی ایک مثال ہے۔ جن مسائل کی نوعیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے اُن سب کی یہی صورت ہے۔ درحقیقت اسلام نے ایسے بے شمار عام ضابطے وضع کیے ہیں جن کی جزئیات کی ہر زمانے کے مخصوص حالات سے مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے۔

علاوہ ازیں جو مذہبی رہنما ان معاملات میں حاکمِ مجاز کا رُتبہ رکھتے ہیں ان کے بھی کچھ اختیارات ہیں جن کی اسلامی شریعت میں بڑی احتیاط سے تشریح کر دی گئی ہے۔ ان اختیارات کو استعمال میں لاتے ہوئے وہ بزرگوار (مجتہدین) جب بھی ضروری سمجھیں مخصوص حالات کی ضروریات سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ تمباکو کے استعمال کے عارضی امتناع اور ایک خارجی ملوکیت پسند کمپنی کی اقتصادی ناکہ بندی کے بارے میں ۱۳۰۹ھ ہجری میں ایک حاکمِ شرع نے ایران میں جو فتوےٰ دیا تھا اس کی نوعیت ایسی ہی تھی۔ اسلامی اصطلاح میں اس قسم کا فتوےٰ 'حکم الفقیہ' کہلاتا ہے۔

صالح حکّام مذہب کو فرسودہ نہیں ہونے دیتے

معاشرے کی بدلتی ہوئی ضروریات پوری کرنے کے لیے اسلام نے اسی نوعیت کی طرزِ زندگی کو مدِّ نظر رکھا ہے اور یوں اس نے بدلتے ہوئے حالات کو مستحکم اور غیر مبدّل بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام نے روحانی پیشوا کو اجازت دی ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے فتاویٰ جاری کرے اور مناسب ضوابط ترتیب دے کر انھیں نافذ کرے۔

گو یہ احکام بھی مستحکم احکام کی طرز پر ہی جاری کیے جاتے ہیں لیکن اِن دونوں میں ایک خاص فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ انھیں اپنے نفاذ کی مدّت اور استحکام کے لیے ان ضروریات پر انحصار کرنا پڑتا ہے جو اِن کے جنم کا باعث بنتی ہیں اور جن کے یہ احکام تابع ہوتے ہیں۔ چونکہ اسلامی معاشرہ فطرتاً ایک انقلابی اور ارتقا پذیر معاشرہ ہے لہٰذا یہ قواعد وضوابط بھی بدلتے رہتے ہیں اور نئے اور بہتر قواعد پُرانے قواعد کی جگہ لے لیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آیۂ شریفہ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ روحانی پیشوا کی اطاعت اسی طرح واجب ہے جس طرح اللہ تعالیٰ اور رسولِ اکرمؐ کی اطاعت واجب ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے دَور میں یہ اختیارات رسولِ اکرمؐ اور آپ کی حکومت کو تفویض کیے گئے۔ بعدازاں یہی اختیارات ائمّہ علیہم السّلام (یعنی روحانی پیشواؤں) کی حکومتوں کو عنایت ہوئے اور پھر اُن کی وساطت سے دوسری جائز حکومتوں کے سپُرد کیے گئے۔

لہٰذا آنحضرتؐ کے بعد روحانی پیشوا ائمّہ علیہم السّلام ہیں جو ملکوتی

تقدّس کے حامل ہیں اور مابعد کے ادوار میں صرف وہی لوگ اس منصبِ جلیلہ پر فائز ہو سکتے ہیں جو ان کے صحیح نمائندے اور نائب ہوں۔

ان اختیارات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اگر نئے حالات اور وقت کے نئے تقاضوں کے مطابق قوانین پہلے سے موجود نہ ہوں تو ایک اسلامی حکومت اسلام کے بنیادی اصولوں اور رسولِ اکرمؐ کی احادیث سے استفادہ کرتے ہوئے ایسے قوانین وضع کر سکتی ہے۔

اسلامی حکّام اس بات کا اختیار رکھتے ہیں کہ ہر زمانے اور ہر ملک کی بدلتی ہوئی ضروریات اور حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اسلامی معاشرے کی احتیاجات اس انداز سے پوری کریں کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو منسوخ کرنے یا اُن کی خلاف ورزی کرنے کا سوال پیدا نہ ہو۔

اجتہاد

اجتہاد سے مراد یہ ہے کہ احکامِ خداوندی کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کی آیات اور رسولِ اکرمؐ اور ائمہ علیہم السّلام کے افعال اور اقوال سے فتویٰ کے استخراج کی پوری تندہی سے کوشش کی جائے۔ رسولِ اکرمؐ کے دَور میں اجتہاد ایک بڑا زود اثر اور بنیادی کردار ادا کرتا تھا اور درحقیقت یہ مستقبل اور ماضی کے درمیان ایک پُل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اسلامی دستور کو جاودانی رکھنے کے لیے ایک مقدّم شرط ہے اور اسے بجا طور پر اسلام کی قوّتِ محرّکہ کہا جاتا ہے۔

مشہور مسلمان فلاسفر ابو علی سینا (۳۷۰ تا ۴۲۸ ہجری) نے اِس مسئلے کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بڑے روشن انداز میں بیان کیا ہے:

اسلام کے تغیّر ناپذیر اور جاودانی اصولوں کی تعداد محدود ہے۔ تاہم واقعات اور حوادث مخصوص مسائل کو جنم دیتے ہیں لہٰذا ہر دَور میں ایسے علماء کی موجودگی ضروری ہے جو اسلامی دستور، عالمی مسائل اور وقت کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہوں تاکہ وہ اجتہاد کی رُو سے ان مخصوص مسائل کا حل دریافت کرسکیں یعنی کلام اللہ اور احادیث سے فتاویٰ کا استخراج کرسکیں۔

اور ایسا اہتمام ضروری بھی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا بے پناہ رفتار سے پیش رفت کررہی ہے اور آئے دن ایسے عجیب وغریب اور نئے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کا ماضی میں گمان بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان نئے نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک ایسے زندہ اور روشن خیال فلسفۂ قانون کا موجود ہونا اشد ضروری ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ چل سکے اور انسان کی نئی زندگی کو اسلامی فقہ کے دلائل اور معانی سے ہم آہنگ کرسکے تاکہ علم کی پیش رفت کے ساتھ ساتھ مذہب کی روح کو انسانی دل ودماغ میں سمویا جاسکے۔

زمانے کی ضروریات کا تقاضا ہے کہ علماء اسلامی فقہ کو اس انداز سے پیش کریں کہ اس کی روشنی اور رہنمائی میں نئے مسائل کو سمجھنے اور انھیں حل کرنے کے لیے اس کی ضرورت ثابت ہوسکے۔ یہ اقدام لازمی ہے تاکہ مذہب فرسودہ اور جامد ہوکر دوبارہ ماضی کی گود میں نہ چلا جائے۔

استخراج کردہ آراء کی روایات کے بارے میں ایک شخص کہتا ہے:

اسحٰق بن یعقوب نے ایک خط امامِ عصر کی خدمت میں پیش کیا

جس میں اس نے اُس حل کا ذکر کیا جو اس نے ان مصائب کے لیے تلاش کیا تھا جن سے اُسے دوچار ہونا پڑا تھا۔ امام علیہ السّلام کے نائبِ خاص محمّد بن عثمان ثمری نے وہ خط امام علیہ السّلام کے سامنے رکھّا۔ آپ نے خود اپنے ہاتھ سے اس خط کا یوں جواب دیا:

"تمھیں چاہیئے کہ مصائب اور حوادث کے بارے ہمارے راویوں سے رجوع کرو کیونکہ وہ اسی طرح ہماری حجّت ہیں جس طرح ہم اللہ کی حجّت ہیں"۔

درحقیقت اس روایت میں مصائب سے مراد وہ نئے نئے مسائل ہیں جو آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ عریضہ لکھنے والے نے یہ دریافت کیا تھا کہ اس صورت میں جب کہ لوگوں کو امام علیہ السّلام تک رسائی حاصل نہیں اگر انھیں نئے مسائل سے سابقہ پڑے تو وہ انھیں حل کرنے کے لیے کیا لائحۂ عمل اختیار کریں۔ امام علیہ السّلام نے اس کا یہ جواب دیا کہ ایسے حالات میں لوگوں کو چاہیئے کہ فقہاء اور حکّامِ شرع سے رجوع کریں۔

کچھ معاصر قانون دانوں کا خیال ہے کہ یہاں واقعات سے مراد مسائل اور اُن کے بارے میں شرعی فتاویٰ نہیں ہے کیونکہ ان صورتوں میں فقہاء سے رجوع کرنا اہلِ شیعہ کے نزدیک ایک عام دستور ہے۔ ان کی رائے میں واقعات سے مراد وہ مسائل ہیں جو عامّۃ المسلمین کی زندگی میں پیدا ہوتے رہتے ہیں یعنی جو مسلمانوں کے تہذیبی، فکری، معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی حالات پر پوری طرح محیط ہوتے ہیں۔

بہر حال خواہ ان سے مراد واقعات اور حوادث ہوں یا وہ

ایسے مسائل پر دلالت کرتے ہوں جو ہر دَور اور ہر زمانے میں اُبھرتے ہوں اور پھر فرو ہو جاتے ہوں۔ درحقیقت ان کے ایک اور صرف ایک معنی ہیں اور وہ یہ کہ دونوں صورتوں میں اپنا وظیفہ دریافت کرنے کے لیے مجتہدین سے رجوع کریں۔ شیعہ فقہ کی یہ پیش بندی روشن خیالی پر مبنی ہے کیونکہ ہر دَور میں ایسے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا کوئی حل سابقہ قوانین میں نہیں ملتا لہٰذا فقہ کے لیے لازم ہے کہ اس حقیقت کو مدّ نظر رکھّے اور مسائل کو عِلم اور استخراجی فیصلوں کی میزان میں تول کر انھیں حل کرے اور ان کا جواب مہیّا کرے۔

مختلف اَدوار کی فقہی تالیفات کے مطالعے اور تحقیق سے ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نئے مسائل ہمیشہ پیدا ہوتے رہے ہیں اور مجتہدین نے ان کا حل مہیّا فرمایا ہے۔ یوں ہماری فقہ کا حجم رفتہ رفتہ بڑھتا رہا ہے مثلاً جب ہم شیخ ابوجعفر طوسی (۴۰۰ ہجری) سے ماسبق کی فقہ پر لکھّی گئی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ وہ کتابیں بہت مختصر ہیں اور اس زمانے کے مسائل بڑے محدود تھے۔ پھر شیخ طوسی نے فقہ کا دائرۂ عمل وسیع کیا اور اپنی مشہور کتاب "المبسوط" تالیف کرکے ایک انقلاب برپا کر دیا۔

یوں جوں جوں وقت گزرتا گیا فقہاء اور دانشوروں کی کاوشوں کی بدولت فقہ کی ضخامت بھی بڑھتی گئی حتّٰی کہ ایک صدی پہلے "جواہر" کے مؤلّف نے اپنی پوری زندگی صَرف کرکے احکامِ فقہ کا ایک مجموعہ مرتّب کیا۔

ہمارے زمانے میں فقہ کا دائرۂ کار اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ کسی ایک شخص کے لیے اس کے تمام مضامین کے بارے میں مکمّل تحقیق و تدقیق سے لکھنا یا ان کا درس دینا ممکن نہیں رہا۔ اس حقیقت سے اس امر کی بخوبی نشاندہی ہوتی ہے کہ کس طرح اسلام نے مختلف اَدوار میں تغیّر، انقلاب اور نئے پن کی پیش بندی کی ہے اور مجتہدین کو ان تبدیلیوں سے پیدا ہونے والے مسائل حل کرنے کا ذمّے دار ٹھہرایا ہے۔

اجتہاد کا اصلی راز یہی ہے کہ وہ اسلام کو مختلف اَدوار کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ یوں اسلام ان تمام فیصلوں اور احکام کا احاطہ کرتا ہے جو روزِ قیامت تک دیے جا سکتے ہیں اور جن کی دنیا کو اپنی فلاح و بہبود اور ارتقا کے لیے ضرورت ہے۔

الکافی میں ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان ہے: "قرآن مجید اور احادیث بنی نوع انسان کی تمام ضروریات پوری کرتی ہیں"۔ قرآن مجید ہر چیز کی وضاحت کرتا ہے۔ امامؑ نے قسم کھا کر فرمایا ہے کہ تمام ادوار میں مسلمانوں کو جو جو ضروریات پیدا ہوں گی اُن کا حل اسلام میں موجود ہے اور اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

یہ محض ایک دعویٰ نہیں بلکہ ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف مشرق اور مغرب کے ماہرینِ قوانین نے کیا ہے۔ انھوں نے اِس امر کو بھی مانا ہے کہ اسلام کی تعلیمات ایک جاودانی قانونی نظام کا زندہ مکتب ہیں۔

یورپ کے مایۂ ناز فلسفی سنتایانا (Santayana) کا کہنا ہے کہ:

"اسلامی فقہ کا ضابطہ قانونی مندرجات کے لحاظ سے اِس قدر

جامع ہے کہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی تنظیم کے لیے یہ ایک مکمّل نظامِ قانون ہے۔"

پروفیسر ہاکن (Hockin) جو ایک معروف امریکی دانشور اور ہارورڈ یونیورسٹی میں فلسفے کے اُستاد ہیں اپنی مشہور تصنیف میں اسلامی فقہ کے اصولوں پر رائے زنی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اسلامی ممالک کی ترقّی کا راز اس امر میں پوشیدہ نہیں کہ وہ مغربی طرزِ زندگی اور اس کی اقدار کی نقّالی کریں اور انھیں اپنے آپ پر مسلّط کرلیں۔ بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا اسلام میں نئے خیالات کی تخلیق کی گنجائش ہے اور کیا کوئی ایسا پائدار اور قابلِ ذکر ضابطہ تیّار ہوسکتا ہے جو زندگی کی نئی ضروریات اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہو؟ اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ صرف یہی نہیں کہ اسلام ترقّی کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ اس میں دوسرے نظاموں کے مقابلے میں ارتقاء کی زیادہ استعداد ہے۔ اسلامی ممالک کی مشکل یہ نہیں کہ اسلامی نظامِ حیات میں ترقّی کی گنجائش نہیں۔ بدقسمتی سے اصل مشکل یہ ہے کہ ان ممالک میں اس جذبے کا فقدان ہے جس کے ذریعے وہ اسلامی ضابطے کی ان شقوں سے استفادہ کرسکتے ہیں جو ترقّی کی جانب رہنمائی کرتی ہیں۔"

باب پنجم

اسلامی تعلیمات

اسلامی تعلیمات

اسلامی تعلیمات انسان کی پوری زندگی پر محیط ہیں۔ مجملاً انھیں دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی :

(۱) اللہ تعالیٰ سے انسان کے تعلّقات۔

(۲) بنی نوع انسان سے انسان کے تعلّقات۔

عبادت اور پرستش پر مبنی اعمال

عبادت کرتے وقت انسان اپنے دل و دماغ کو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مشغول کرتا ہے اور یوں اپنی روح کو اِس مادّی دُنیا سے ماوراء لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو گناہ کی کثافتوں سے پاک کرنے اور اپنے اندر گراں قدر انسانی خصوصیات پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے۔ وہ نااُمیدی اور مایوسی کے اسباب سے نجات پانے کے لیے خدائے بزرگ و برتر سے مدد کا خواستگار ہوتا ہے اور اُس ذاتِ اقدس سے اپنا احساسِ ذمّے داری قائم رکھنے کے لیے اُسے یاد رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: "اور مجھے یاد رکھنے کے لیے نماز قائم کرو"۔ لہٰذا یہ امر واضح ہے کہ عبادت پر مبنی اعمال کا فائدہ خود عبادت گزار کو پہنچتا ہے۔

عبادت کا تربیتی اثر

عبادت پر مبنی اعمال مخصوص حضورِ قلب اور چند رسوم کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ہماری عبادات کی کوئی حاجت نہیں۔ اس کے برعکس اُس ذاتِ اقدس کی عبادت اور پرستش کے ذریعے ہم خود بڑے عظیم اخلاقی اور تعلیمی فوائد حاصل کرتے ہیں۔

معروف سائنس داں الیکسس کارل (Alexis Carrel) کے قول کے مطابق جب انسان کو اپنے دل میں اُمّید اور عزم پیدا کرنے کے لیے مناسب الفاظ نہ مل سکیں تو پھر عبادت اور مناجات ہی ہے جو اعتماد کا احساس پیدا کرکے انسان کو ہمّت اور حوصلے کے ساتھ زندگی کے پیچیدہ مسائل سے نمٹنے کی قوّت عطا کرتی ہے۔ یہ احساس ہر شخص کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔

عبادت انسان کی عادات اور اخلاق پر ایک اَنمٹ نقش چھوڑتی ہے تاہم یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مبنی بَر عبادت اعمال باقاعدگی سے بجا لائے جائیں۔

جن معاشروں نے عبادت کی روح کو فنا کر دیا ہے وہ اکثر و بیشتر فتنہ و فساد اور تباہی و بربادی سے نہیں بچ سکے۔

عبادت گزاری اور پرستش کے اثرات اتنے فوری اور خوش آئند

ہوتے ہیں کہ انسان کو جسمانی طور پر ان کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔

اسی سائنس داں کے مطابق پرستش کے نتائج کا تعیّن سائنسی طور پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ عبادات محض جذبات پر ہی نہیں بلکہ جسمانی حالات پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں اور بعض اوقات ان کے ذریعے جسمانی بیماریوں سے چند لمحوں یا چند دنوں میں شفا حاصل ہو جاتی ہے۔

عبادات پر مبنی اسلامی اعمال بہت سادہ ہیں اور ان کا بجا لانا بالکل آسان ہے۔ جہاں تک بیمار اور کمزور اشخاص کا تعلّق ہے انھیں ان عبادات کی بجا آوری کے سلسلے میں کافی رعایتیں بھی دی گئی ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جذباتی، نفسیاتی اور اخلاقی اثرات کے علاوہ جن کی نوعیت شخصی ہے اسلامی عبادات معاشرے پر بھی بڑے گہرے اثرات چھوڑتی ہیں۔

نماز

اہم ترین اسلامی عبادات میں سے ایک نماز ہے جو دن رات میں پانچ مرتبہ بڑی سادگی اور خلوص سے ادا کی جاتی ہے۔ یہ قوّتِ ایمان کو مضبوط کرنے اور عبادت گزار کے دل و دماغ کو گناہ کی کثافتوں سے پاک کرنے کے سلسلے میں بڑے نمایاں اخلاقی اور عملی اثرات پیدا کرتی ہے۔ چونکہ اس کی شرائط میں سے ایک پاکیزگی بھی ہے لہٰذا یہ ہر مسلمان کو تاکید کرتی ہے کہ وہ اپنا بدن اور لباس صاف ستھرا اور پاک و پاکیزہ رکھے۔

یہ ضروری ہے کہ نماز گزار کا لباس اور وہ مقام جہاں وہ نماز ادا کر رہا ہو' نامشروع طریقوں سے حاصل نہ کیے گئے ہوں۔ اِس سے انسان کو یہ سبق ملتا ہے کہ وہ دوسروں کے مال پر ناجائز قبضہ نہ کرے اور نہ ہی اس کا غلط استعمال کرے۔ چونکہ نماز مقررہ اوقات پر ادا کی جانی چاہیئے اس لیے یہ انسان کو نظم وضبط اور وقت کی پابندی سکھاتی ہے اور صبح جلدی جاگنے کا عادی بناتی ہے۔ یہی خوبیاں دنیا کی اکثر وبیشتر عظیم شخصیتوں کی کامیابی کا راز ہیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں نماز انفرادی طور پر پڑھنے سے باجماعت پڑھنا بہتر ہے۔ نمازِ باجماعت میں سب نمازی بلاتفریق وامتیاز اللہ کے حضور کھڑے ہوتے ہیں اور عبادت کی پُرمعنی اور مؤثر رسوم برادرانہ انداز سے بجا لاتے ہیں۔ نمازِ باجماعت ہمیں مساوات، اخوت، یگانگت اور اتّفاق کا درس دیتی ہے۔

روزہ

عباداتِ اسلامی کا ایک اور عمل روزہ ہے جو ہمیں ضبطِ نفس اور خواہشات کا مقابلہ کرنا سکھاتا ہے۔

معاشرتی نقطۂ نظر سے روزہ لوگوں کو اِس بات پر مائل کرتا ہے کہ وہ محتاجوں اور مسکینوں سے عملی ہمدردی کا مظاہرہ کریں۔ جہاں تک حفظانِ صحت کا تعلّق ہے اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ روزہ مرض کے سدِّباب میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے اور شفابخش بھی ہے۔ یہ انسانی جسم کے اندرونی نظام کو درست کرتا ہے اور ان غذائی

اجزا کو تحلیل کر دیتا ہے جو صحیح طور پر ہضم نہ ہو سکنے کی وجہ سے فالتو چربی اور موٹاپے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور بہت سی بیماریوں اور تکالیف کو جنم دیتے ہیں۔ روزہ بہت سی بیماریوں کے انسداد کے لیے ایک مؤثر پیش بندی کا کام دیتا ہے اور کئی ایک امراض سے شفا بخشتا ہے۔

حج

عبادات کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات کا ایک اور بہت بڑا کارنامہ دُنیا کے مسلمانوں کا وہ عظیم ترین اجتماع ہے جسے حج کا نام دیا گیا ہے۔ مناسکِ حج اِس قدر ولولہ انگیز، پاکیزہ، اخوت اور مساوات سے مملو ہوتے ہیں کہ ان کا بلا امتیاز ہر شخص پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔

اس اجتماع میں آج بھی دُنیا کے مختلف خطّوں میں رہنے والے مسلمان ہر سال لاکھوں کی تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔ یہ اجتماع مختلف نسلوں، رنگوں، زبانوں اور قومیتوں کے لوگوں کو اس بات کا موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ بلا کسی امتیاز کے ایک دوسرے سے برابری کی سطح پر مل سکیں۔ اس کی رسوم کی بجا آوری انسان کو اس کے مادّی خول سے باہر کھینچ لاتی ہے جو درشتی اور عداوت سے عبارت ہے اور اسے اُس فضا میں بلند کرتی ہے جو اخلاص اور نیکیوں سے پُر ہے۔ یہ رسوم جذبات کو شستگی اور احساسات کو تازگی بخشتی ہیں۔

حج کے اجتماعات تمام دُنیا کی سطح پر ایک اسلامی ملّی کانفرنس کا مقصد پورا کرتے ہیں اور سیاسی و اقتصادی نقطۂ نگاہ سے مسلمانوں کی باہمی ہم آہنگی کا راستہ ہموار کرتے ہیں۔ یہ عظیم اجتماعات مختلف معاشی

ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے مسلمانوں کے مابین ایک متحد کرنے والی قوّت اور رشتے کا کام دیتے ہیں اور انھیں موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھیں اور تبادلۂ خیالات کریں۔ اسلام میں عبادت اور ایمان پر مبنی تمام اعمال کا جائزہ لینے سے پتا چلتا ہے کہ ان سب کے اخلاقی اور معاشرتی دونوں پہلو ہیں۔ اس سے ہمارے اس سابقہ قول کی تائید ہوتی ہے کہ ہمارے مبنی بر عبادت اعمال کا فائدہ سراسر ہمیں ہی پہنچتا ہے۔

انسانوں کے باہمی تعلّقات

اسلامی تعلیمات کا یہ حصّہ تمام معاشرتی مسائل پر محیط ہے۔ اپنے منفرد نظام کی روشنی میں اسلام اپنے پیروؤں کو تعلیم دیتا ہے کہ انھیں کیا ہونا چاہیے، زندگی کیسے گزارنی چاہیے اور ان کے ذمّے معاشرے کے جو حقوق ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کا کیا طریقہ ہے۔

مسلمان کو جن حقوق کا لحاظ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے وہ کثیر اور مختلف النوع ہیں۔ ان کا دائرہ اُستادوں، والدین، دوستوں، ہمسایوں، دینی بھائیوں اور بنی نوع انسان کے حقوق سے لے کر جانوروں وغیرہ کے حقوق تک پھیلا ہوا ہے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے معاشرے کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے انسان کی اس قدر اہمیّت ہے کہ اس کی جان کی کوئی قیمت لگائی ہی نہیں جا سکتی۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

" اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو قتل کر دے تو بجز اس صورت

کے کہ مقتول خود قتل یا روئے زمین پر فساد پھیلانے کا مجرم ہو یوں سمجھ لینا چاہیئے کہ قاتل نے ساری انسانیت کو قتل کر دیا ہے اور اگر کوئی کسی دوسرے شخص کی جان بچالے تو یوں سمجھنا چاہیئے کہ اُس نے تمام بنی نوع انسان کی جان بچا لی ہے۔"

اس میں کوئی کلام نہیں کہ انسانی معاشرے کے بدن کے تمام اعضاء کی یک رنگی کی بنا پر ایک فرد کا نقصان سارے معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے اور یوں ایک اعتبار سے فرد اور معاشرہ ایک دوسرے سے مماثل ہو جاتے ہیں۔

رسولِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تمام اہلِ ایمان ایک ہی جسم کے اعضاء ہیں۔ اگر کسی ایک عضو میں درد ہو تو دوسرے اعضاء کو بھی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

اِسی حدیثِ نبویؐ سے فیضان حاصل کرتے ہوئے معروف شاعر سعدیؔ شیرازی نے کہا ہے کہ ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگرند — کہ در آفرینش ز یک جوہرند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

جیسا کہ ہم جانتے ہیں اسلام میں نسل، رنگ یا جغرافیائی خطے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ چنانچہ یہ بات خارج از امکان نہیں کہ تمام انسانی معاشرے ایک مشترکہ عقیدے (اللہ اور اس کے فرستادہ نبیوں پر ایمان اور نیک اعمال سے وابستگی) کی بنا پر ایک دستور اور ایک پالیسی پر مبنی ایک عالمی حکومت قائم کرلیں جس میں تمام نسلی اور جغرافیائی

اکائیاں مدغم ہو جائیں۔

مسلمانوں کے دوسری قوموں سے تعلّقات

اِس معاملے میں بھی اسلامی تعلیمات کے دو پہلو ہیں:

(۱) اسلامی تشخّص کا برقرار رکھنا۔

(۲) غیر مسلموں سے امن پسندانہ تعلّقات قائم کرنا۔

اسلامی معاشرے کی آزادی اور یک جہتی برقرار رکھنے کے لیے اِس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلم معاشروں میں ضم نہ ہونے دیا جائے اور ان کے اہم معاملات میں انھیں تمام خارجی اثرات سے محفوظ رکھّا جائے۔ اسی بنا پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ مسلمان غیر مسلموں پر کبھی بھی پورا پورا بھروسہ نہ کریں اور اپنے راز انھیں نہ بتائیں۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

"اے ایمان والو! اپنی قوم کے لوگوں کے علاوہ دوسروں کو اپنا ہم راز نہ بناؤ کیونکہ وہ تمھاری کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔"

اسلام مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ جو لوگ اسلام کے مخالف ہیں جب تک وہ اپنا رویّہ بدل نہ لیں اور معاندانہ پالیسی ترک نہ کر دیں ان کے ساتھ دوستانہ روابط پیدا نہ کریں۔ اس بارے میں قرآن مجید یوں ارشاد فرماتا ہے:

"جو لوگ اللہ اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہیں اُنھیں تم ایسے لوگوں سے محبّت کرتے نہ دیکھو گے جو اللہ اور اُس کے

رسولؐ کے خلاف لڑتے ہیں خواہ وہ اُن کے باپ، بیٹے، بھائی یا دوسرے اقربا ہی کیوں نہ ہوں۔"

اِس کے ساتھ ساتھ اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ مسلمان دُنیا میں ایک طاقتور اور فعال قوم کی حیثیت سے رہیں اور باہمی احترام کے صحت مندانہ ماحول میں دوسروں کے کردار کے مثبت پہلوؤں سے فائدہ اٹھائیں چنانچہ وہ انھیں حکم دیتا ہے کہ اہلِ کتاب کے ساتھ تعلقات کے بارے میں پُر امن بقائے باہمی کے اصولوں پر عمل پیرا ہوں۔ علاوہ بریں وہ مسلمانوں کو یہ تاکید بھی کرتا ہے کہ وہ اسلامی ممالک میں ان کی بطور ذمّی حفاظت کریں اور جب تک وہ کسی جُرم کی بِنا پر سزا کے مستوجب نہ ہوں اُن کے حقوق کا احترام کریں۔ تاہم کچھ ایسی شرائط بھی ہیں جن پر عمل پیرا ہونا ذمّیوں کے لیے لازمی ہے۔

اگر مسلمانوں کے مفادات اس امر کے متقاضی ہوں تو مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ معاہدے بھی کر سکتے ہیں بشرطیکہ ایسا کرنے سے ان کی خود داری، آزادی اور بہبود کو کوئی زک نہ پہنچے۔ جب کوئی ایسا معاہدہ ہو جائے تو مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس کی پوری پوری پابندی کریں اور اس وقت تک اس معاہدے کی خلاف ورزی نہ کریں جب تک دوسرا فریق ایسا کرنے میں پہل نہ کرے۔ معاہدوں کی پابندی اسلام کے عام دستور میں شامل ہے اور اس کا اطلاق سب معاہدوں پر ہوتا ہے خواہ وہ مسلمانوں سے کیے گئے ہوں یا فریقِ ثانی غیر مسلم ہو۔ کسی معاہدے کی خلاف ورزی اِس بِنا پر کرنا جائز نہیں کہ فریقِ ثانی مسلمان نہیں ہے۔

اسلام عالمگیر چوکسی کا حکم دیتا ہے

ہر مسلمان پر مندرجہ ذیل دو چیزیں واجب ہیں :

(۱) —— لوگوں کو اچھّے کام کی دعوت دینا۔

(۲) —— بُرائیوں سے مبارزہ کرنا۔

یہ واجبات جنھیں شرعی اصطلاح میں امر بالمعروف (اچھّائیوں کا حکم دینا) اور نہی عن المنکر (برائیوں سے روکنا) کہا جاتا ہے تمام مسلمانوں پر یہ ذمّے داری عائد کرتے ہیں کہ وہ معاشرے پر مسلسل کڑی نگاہ رکھیں۔ اگر وہ کسی شخص کو عدل و انصاف اور حق و صداقت کے راستے سے بھٹکتا ہوا دیکھیں تو اُنھیں چاہیے کہ اُسے صحیح راستے کی جانب بلائیں اور اگر کوئی شخص جُرم یا گناہ کا ارتکاب کر رہا ہو تو اُسے ایسا کرنے سے باز رکھیں۔

اس حکم کو اسلام کا ایک اہم ضابطہ سمجھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں قُرآن مجید یوں ارشاد فرماتا ہے :

"تم بہترین امّت ہو جسے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم لوگوں کو اچھّائیوں کا حکم دیتے ہو اور انھیں برائیوں سے روکتے ہو۔"

ابو عبداللہ امام جعفر الصادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے :

"جو شخص اپنے ہاتھ، زبان یا دل سے خرابیوں کے خلاف مبارزہ نہیں کرتا اُس کی زندگی برائے نام ہے۔"

درحقیقت ان دو اہم واجبات کی ادائیگی اجتماعی زندگی کی ذمّے داریوں کا ایک حصّہ ہے۔ معاشرتی زندگی میں سوسائٹی کے تمام افراد

ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں اور اسی بِنا پردہ ایک دوسرے کے کردار سے بھی بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

اسلام ہر مسلمان کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی معاشرتی حس مکمّل طور پر بیدار رکھتے ہوئے اجتماعی مفادات کا پورا پورا خیال رکھے۔ وہ ہر فرد کو معاشرے کے دوسرے ارکان کے سامنے جوابدہ گردانتا ہے اور اسی طرح معاشرے کو افراد کے سامنے ذمّے دار سمجھتا ہے۔ سب مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کی غلطیوں کی نشاندہی کر کے ان کی اصلاح کریں اور یوں ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کریں۔

اسلامی اقتصادیات

چونکہ ایک دولت مند اور باصحت معیشت کے بغیر کسی معاشرے کی خوشحالی اور اخلاقی و مادّی بہبود ممکن نہیں لہٰذا ایک ترقّی پسند مذہبی نظام کی حیثیت سے اسلام نے اس مسئلے کو بھی اپنے پروگرام میں شامل کر لیا ہے۔

زکوٰۃ

ثروت مندوں اور غریبوں کے درمیانی خلا کو کم کرنے کے لیے اسلام نے زکوٰۃ کا قانون نافذ کیا ہے اور خوشحال لوگوں کو حکم دیا ہے کہ اپنی دولت اور ذاتی آمدنی کا ایک مناسب حصّہ بطور زکوٰۃ بیت المال میں جمع کرائیں۔ اِس طرح ایک خطیر رقم اکٹھی ہو جاتی ہے جو غربت کا

قلع قمع کرنے، طبقاتی خلا کو پُر کرنے اور معاشرے کی ہمہ پہلو ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ پیشوایان اسلام نے فرمایا ہے کہ زکوٰۃ کا نصاب اتنی احتیاط سے مقرّر کیا گیا ہے کہ اگر وہ تمام لوگ جن پر زکوٰۃ واجب الادا ہے اس کی ادائیگی دیانت داری سے کریں تو غربت اور ناداری کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔ غربت اسی لیے باقی ہے کہ بہت سے لوگ ایماندارانہ طور پر زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں کرتے۔

مالِ زکوٰۃ کے جو آٹھ مصارف متعیّن کیے گئے ہیں وہ اسلامی قانون کے اغراض و مقاصد کی بخوبی وضاحت کرتے ہیں اور ایک صحت مند معاشرہ تشکیل دینے کے سلسلے میں اس کے کردار پر روشنی ڈالتے ہیں۔

جن آٹھ کاموں پر زکوٰۃ کا مال صَرف کیا جا سکتا ہے ان کی تشریح قرآن مجید میں اِن الفاظ میں فرمائی گئی ہے:

"خیرات تو بس خاص فقیروں کا حق ہے اور محتاجوں کا اور اس (زکوٰۃ وغیرہ) کے کارندوں کا اور جن کی تالیفِ قلب کی گئی ہے (ان کا)، اور جن کی گردنوں میں (غلامی کا پھندا پڑا ہے ان کا)، اور قرضداروں کا (جو خود سے ادا نہیں کر سکتے) اور خدا کی راہ (جہاد) میں اور پردیسیوں کی کفالت میں (خرچ کرنا چاہیے یہ حقوق) خدا کی طرف سے مقرّر کیے ہوئے ہیں اور خدا بڑا واقف کار حکمت والا ہے۔" (سورۂ التوبہ۔ آیت ۶۰)

یہ بات بھی مدِّ نظر رکھنی چاہیے کہ "فی سبیل اللہ" کی اصطلاح بڑی وسیع ہے اور تمام ترقیاتی منصوبوں مثلاً تعلیم، صحت، پُلوں، سڑکوں،

ہسپتالوں اور مدرسوں وغیرہ کی تعمیر اور ایسے ہی دوسرے تمام شعبوں پر محیط ہے۔

خُمس

خُمس سے مراد سال بھر میں ہونے والی آمدنی میں سے اتنی ہی مدّت کے مصارف منہا کرنے کے بعد جو کچھ بچ جائے اُس کے پانچویں حصّے کی ادائیگی ہے۔ یہ ایک اسلامی ٹیکس ہے جو اجتماعی زندگی کی ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مثلاً محتاجوں کی مدد، غربت کے خاتمے، اسلام کی تبلیغ اور اسلامی معاشرے کی دوسری مادّی اور اخلاقی احتیاجات پوری کرنے کے لیے عائد کیا گیا ہے۔ خمس ساری آمدنی پر نہیں بلکہ صرف بچت پر واجب الادا ہے لہٰذا جن لوگوں کی آمدنی ان کے اخراجات کے برابر یا اس سے کم ہو اُن کے لیے خمس ادا کرنا ضروری نہیں اور فقط اُن اشخاص کے لیے اپنی بچت کا پانچواں حصّہ بیت المال میں جمع کرانا واجب ہے جن کی آمدنی اُن کے مصارف سے زیادہ ہو۔ اس طرح کافی رقم جمع ہو جاتی ہے جسے مسلمانوں کے بہت سے دینی، معاشرتی اور مادّی مسائل حل کرنے پر صرف کیا جا سکتا ہے۔

خمس فقط کاروبار اور ملازمت وغیرہ سے کمائی ہوئی آمدنی تک ہی محدود نہیں بلکہ جو دولت کان کنی سے اور غوطہ لگا کر سمندر کی تہہ سے حاصل کی جائے اور جو ایسا دفینہ زمین سے برآمد کیا جائے جس کا کوئی مالک نہ ہو اس پر بھی واجب الادا ہے۔ ان تمام صورتوں میں خمس کی ادائیگی کھدائی وغیرہ کے اخراجات منہا کرنے کے بعد پوری آمدنی پر کرنی ہوتی ہے۔

خمس کی مد میں حاصل شدہ رقوم کی تقسیم اوراُن کے مصرف کے اغراض ومقاصد کے متعلّق اسلامی فقہ کی کتابوں میں بالتفصیل بحث کی گئی ہے اور اس مختصر کتاب میں اس کا اعادہ ممکن نہیں۔

صدقہ اور خیرات

گو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا واجب نہیں تاہم اسلام نے اِس کارِ خیر کو بڑی اہمیّت دی ہے اور قرآن مجید میں اس بارے میں متعدّد آیات موجود ہیں۔

لوگوں میں دولت کی منصفانہ تقسیم اور غربت کے خاتمے کے لیے جو تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں ان میں سے ایک خیرات اور صدقات کی ادائیگی بھی ہے۔ خیرات مستحق افراد کو دی جاسکتی ہے یا رفاہی کاموں پر خرچ کی جاسکتی ہے۔ اگر صدقات اور خیرات کی تقسیم ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت خداترس افراد کی زیرِ نگرانی انجام دی جائے تو وہ فقراء اور مساکین کی امداد کا ایک مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے۔

وقف

اوقاف کا قیام دولت کی منصفانہ تقسیم میں مدد دیتا ہے اور اسے چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے سے روکتا ہے۔ اوقاف کی دو قسمیں ہیں

(۱) ـــــــ عمومی وقف (Public)

(۲) ـــــــ نجی وقف (Private)

نجی وقف سے استفادہ کرنے والے چند اشخاص یا ایک محدود طبقہ

مثلاً وقف کرنے والے کے بیٹے بیٹیاں یا پوتے پوتیاں ہوتے ہیں۔

عمومی اوقاف کی صورت میں جو کہ زیادہ عام ہیں وقف کردہ جائداد کی ملکیت عامّۃ النّاس یا معاشرے کے ایک بڑے طبقے کو منتقل ہو جاتی ہے اور وہ عمومی جائداد کا ایک حصّہ بن جاتی ہے۔ اسلام نے اوقاف کے قیام کی حوصلہ افزائی کی ہے اور ائمّہ علیہم السّلام نے خود اس سلسلے میں مثالیں قائم کی ہیں۔ اوقاف کے قیام سے نجی جائداد کا ایک معتدبہ حصّہ عمومی جائداد میں منتقل ہو جاتا ہے اور عامّۃ النّاس اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ یہ عمل بجائے خود دولت کی منصفانہ اور متوازن تقسیم کی جانب ایک طویل قدم ہے۔

دولت کس طرح وجود میں آتی ہے

اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق ہر چیز دراصل اللہ تعالٰی کی ملکیّت ہے۔ جو کچھ بھی کائنات میں ہے سب کا سب اُسی کا ہے۔ اُس کی مالکیّت مطلق ہے اور تخلیقی پہلو لیے ہوئے ہے کیونکہ وہی ہر چیز کا خالق اور پروردگار ہے۔ "جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے سب اُس کی ملکیّت ہے"۔

لٰہذا دوسرے لوگ کسی چیز کے مالک فقط اُس ذاتِ اقدس کی اجازت اور اس کے جاری کردہ قوانین کے مطابق ہی بن سکتے ہیں۔

نجی ملکیّت

اسلام نجی ملکیّت کا احترام کرتا ہے اور ہر شخص کو اپنی محنت کے

ثمر کا مالک اور حقدار تصوّر کرتا ہے۔ یہ دینِ متین محنت کو مالکیت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ یہ ایک فطری قانون ہے جس کی تصدیق اسلام نے کی ہے۔ ہر شخص فطری طور پر اپنے وجود اور اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کا مالک ہے اور چونکہ جو کچھ وہ پیدا کرتا ہے وہ دراصل اس کے اندر موجود صلاحیتوں کی ہی ایک معیّن شکل ہوتی ہے لہٰذا اپنی محنت کے پھل کا مالک بھی وہی ہے۔

آبادکاری اور قدرتی وسائل کا حصول

رسولِ اکرمؐ کا ارشادِ گرامی ہے کہ: "جو شخص بنجر زمین کو زیرِ کاشت لائے وہی اس کا مالک ہے۔"

کسی دوسرے شخص کے معدنیات اور دُوسرے قدرتی وسائل کے دریافت کرنے سے پہلے ان چیزوں کی دستیابی انسان کو ان کا مالک بنا دیتی ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق جو شخص ان چیزوں کو حاصل کرے وہی ان کا مالک ہے۔ چونکہ بنجر زمین کو زیرِ کاشت لانے اور قدرتی وسائل کی دستیابی کے لیے محنت درکار ہوتی ہے لہٰذا یہ امر واضح ہے کہ دولت پیدا کرنے میں سب سے اہم عامل محنت ہی ہے۔

بلاشبہ اسلامی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ بنجر زمینوں کی آبادکاری اور کانوں سے معدنیات کے استخراج کی ذمّے داری خود سنبھال لے اور ان ذرائع سے جو آمدنی ہو اُسے رفاہِ عامّہ کے کاموں پر صَرف کرے۔

اسلام محنت کشوں کے حقوق کو بڑی اہمیّت دیتا ہے۔ اسلامی روایات کی رُو سے کسی محنت کش کا حق نظرانداز کرنا ایک ناقابلِ معافی گناہ ہے۔

ایک مشہور حدیث کے مطابق آنحضرتؐ نے ایک دفعہ ایک محنت کش کا ہاتھ جس پر سخت محنت کی وجہ سے ورم آگیا تھا اپنے دستِ مبارک میں پکڑ کر بلند کیا اور فرمایا:

"یہ ہے وہ ہاتھ جسے اللہ اور اس کا رسولؐ پسند کرتے ہیں۔"

دولت کی گردش

اسلام نے جامد دولت یعنی ایسی دولت پر جو گردش میں نہ ہو خصوصی ٹیکس عائد کیے ہیں (مثلاً مسکوک سونا چاندی اگر سال بھر بے مصرف رہیں تو ان پر زکوٰۃ واجب الادا ہو جاتی ہے) اور یوں دولت کی گردش کی ہمّت افزائی کی خاطر ایک عملی قدم اٹھایا ہے۔ قرآن مجید ایسے لوگوں کو قابلِ ملامت قرار دیتا ہے جو ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں یا اپنی دولت بے مصرف پڑی رہنے دیتے ہیں اور معاشرے کی بھلائی کی خاطر استعمال میں نہیں لاتے۔

اس کے علاوہ اسلام تجارت، کھیتی باڑی، مویشیوں کی پرورش اور صنعتوں کے قیام کی بھی بے حد حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ حدیث کی مستند کتابوں میں ایسی بہت سی روایات ملتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کی یہ عین خواہش ہے کہ تمام انسانی اور مالی وسائل کو عامۃ النّاس کی فلاح و بہبود کے لیے مجموعی طور پر بروئے کار لایا جائے۔

سُود

اسلام پیداوار میں افزائش چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سُودی کاروبار کی سختی سے ممانعت کرتا ہے تاکہ کوئی شخص کچھ پیدا کیے بغیر سُود کو

ہی اپنا ذریعۂ معاش نہ بنالے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے سود خوری ایک اخلاقی گناہ ہے اور جو شخص اس قسم کا کاروبار کرے وہ بطور سود کمائی ہوئی دولت کا مالک نہیں بن سکتا لہٰذا اس کا فرض ہے کہ سود کی رقم اس کے اصل مالک کو لوٹا دے۔

سودی کاروبار کی دو قسمیں ہیں اور اسلام میں دونوں حرام ہیں:

(۱) سودی قرضہ

(۲) سود پر مبنی تجارت

سود سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو کچھ رقم اس شرط پر بطور قرض دے کہ وہ اصل رقم کے ساتھ ساتھ کچھ اضافی مال بھی قرض خواہ کو ادا کرے گا۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آیا سود کی شرح زیادہ ہے یا کم اور سود کی ادائیگی نقدی کی صورت میں کی جاتی ہے یا جنس کی صورت میں۔ البتہ اگر مقروض احسانمندی کے اظہار کے طور پر اپنی مرضی سے اصل زر کے ساتھ ساتھ کچھ اضافی مال قرض خواہ کو دے دے جس کے بارے میں کوئی پیشگی شرط طے نہ کی گئی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔

سُود پر مبنی تجارت سے مراد یہ ہے کہ کوئی چیز اُسی جنس کی کسی چیز کے بدلے میں بیچی جائے لیکن مقدار میں فرق ہو۔ مثلاً اگر اعلیٰ قسم کی دس کلوگرام گندم درمیانی قسم کی بارہ کلوگرام گندم کے عوض بیچی جائے تو یہ سود ہی کی ایک قسم ہوگی۔ ایسے ممنوعہ معاملات کی مفصّل شرائط اسلامی فقہ کی کتابوں میں درج ہیں۔

قرضِ حسنہ

اسلام لوگوں کو تلقین کرتا ہے کہ ضرورت مندوں کو زیادہ سے زیادہ

قرضِ حسنہ دیں۔ بعض روایات کے مطابق یہ اتنا عظیم کارِ خیر ہے کہ اس کا ثواب خیرات سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جن لوگوں کو رقم کی ضرورت ہوتی ہے اُن میں بعض ایسے عزّت دار اشخاص بھی ہوتے ہیں جو صدقہ یا خیرات حاصل کرنا اپنی عزّت، خودداری اور وقار کے منافی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرضِ حسنہ دینا خیرات کے مقابلے میں ایک عظیم تر کارِ ثواب سمجھا جاتا ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ اسلام قرض خواہ کو مقروض سے اپنی پوری رقم کی واپسی کی ضمانت حاصل کرنے کی اجازت بھی دیتا ہے۔ اگر مقروض قرضہ واپس کرنے میں ناکام رہے تو قرض خواہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ مطلوبہ رقم مالِ مرہونہ میں سے وضع کرلے اور جو کچھ باقی بچے وہ اس کے مالک کو لوٹا دے۔

قرضِ حسنہ دوستی اور محبّت کے رشتے استوار کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اِس کے ذریعے برتری اور کمتری کے ان اوہام کو دُور کرنے میں بھی مدد ملتی ہے جو اکثر خوشحال اور مقابلۃً غریب افراد کے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ثروت مند لوگ حاجت مند افراد کی جو خدمات انجام دے سکتے ہیں یہ ان کی سب سے سہل صورت ہے۔

اسلام میں جہاد اور دفاع

جہاد کے مسئلے کو اسلامی دستور میں ایک خصوصی حیثیت حاصل ہے۔ دراصل اِس قسم کی شرائط کی عدم موجودگی میں ایک ترقی پذیر اور جامع نظام کی تکمیل ممکن نہیں۔

بعض ناواقف لوگوں کی جانب سے کی گئی غلط تعبیرات کے نتیجے کے

طور پر اسلامی تعلیمات میں جہاد کی شمولیت کے خلاف بے حد معاندانہ پروپیگنڈا کیا گیا ہے اور دشمنانِ اسلام کو یہ کہنے کا موقع میسّر آگیا ہے کہ اسلام تلوار اور طاقت کا دین ہے۔ حد یہ ہے کہ بعض معروف دانشور بھی اس بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ میکڈانلڈ نے اپنے دائرۃ المعارف میں بڑے وثوق سے کہا ہے کہ تلوار اور طاقت کے ذریعے اسلام پھیلانا ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے۔

تاہم جب جہاد کی حقیقت اور مقصد واضح ہو جائے تو پھر یہی نہیں کہ ان اعتراضات کا کھوکھلا پن عیاں ہو جاتا ہے بلکہ اسلامی تعلیمات کی گہرائی، پاکیزگی، تاثیر اور مختلف حالات میں بنی نوع انسان کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ اِس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے ہم قارئینِ کرام کی توجّہ مندرجہ ذیل نکات کی جانب مبذول کراتے ہیں۔

اسلام کی امن پسندانہ پالیسی

ناگزیر جنگیں لڑنے میں مانع نہیں

جہاد کے لغوی معنی سعی اور کوشش کے ہیں۔ اسلامی ماخذ میں بھی یہ لفظ روحانی اور دنیاوی مقاصد کے حصول کی خاطر ہر قسم کی ذہنی، جسمانی، مالی اور اخلاقی کاوش کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ تاہم اصطلاحاً اس کے معنی اسلامی نظام کی حفاظت اور ترقّی کی خاطر مسلّح جدّوجہد کے ہیں۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ کون سے مواقع ہوتے ہیں جب اِس قسم کی جدّوجہد ناگزیر ہوتی ہے۔

ایسے شر پسند عناصر کے خلاف جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے جو انصاف اور صداقت پر مبنی نظام کو اپنے مفادات کے لیے خطرہ سمجھتے ہوں اور اُسے مٹانے پر تُل جائیں۔ جب تک ایسے عناصر دُنیا میں موجود ہیں سچّائی اور انصاف کے حامیوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنے مقاصد اور ہستی کا دفاع کریں۔

دراصل اس صورت میں جنگ اللہ تعالیٰ کے ماننے والوں اور سماجی انصاف پر ایمان رکھنے والوں پر ان کی مرضی کے خلاف جبراً مسلّط کر دی جاتی ہے۔ اسلام کے لیے ایسی صورتِ حال کو ٹالنا ممکن نہیں۔

تاہم اسلام کی امن پسندانہ روح اور جارحیت، مقاومت اور ناانصافی سے اجتناب برتنے والوں سے معاملہ کرتے ہوئے طاقت کے استعمال سے احتراز قرآن مجید کے متعدّد مندرجات سے واضح ہے۔

"جو لوگ دین کی بِنا پر تم سے نہیں لڑے اور جنھوں نے تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا، اللہ تمھیں ان کے ساتھ اچّھا سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے منع نہیں کرتا۔ بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمھیں فقط یہ حکم دیتا ہے کہ جو لوگ تمھارے خلاف دین کی بِنا پر لڑے اور جنھوں نے تمھیں گھروں سے نکالا اور جنھوں نے تمھیں نکالنے میں دوسروں کی مدد کی تم اُن سے دوستانہ تعلّقات نہ رکھّو اور جو لوگ ان سے دوستی پیدا کرتے ہیں وہ" وہ ہیں جو انصاف کرنے والے نہیں ہیں ""

ایک اور مقام پر قرآن مجید صاف صاف فرماتا ہے کہ اگر دُشمن

ہتھیار ڈال دیں اور صلح جوئی کا اظہار کریں تو مسلمانوں کو ان سے مخاصمت کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

"اگر وہ تم سے چھیڑ چھاڑ نہ کریں اور تم سے جنگ کرنے سے اجتناب برتیں اور تمھاری طرف صلح کا ہاتھ بڑھائیں تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے ان کے خلاف جارحیت کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں چھوڑی۔"

ایک اور آیت میں رسولِ اکرمؐ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہدایت فرمائی گئی ہے کہ: "اگر دشمن صلح کی جانب مائل ہوں تو تم بھی صلح کی جانب مائل ہو جاؤ۔"

شاید دُنیا میں کوئی اور ایسا مذہب نہیں جس نے ایسے واشگاف الفاظ میں اپنے صلح جویانہ عزائم کا اظہار کیا ہو۔ تاہم اسلام کی امن پسندی کا یہ مطلب نہیں لینا چاہیئے کہ اگر کچھ لوگ بنی نوع انسان کی کثیر تعداد کو نوآبادیاتی نظام میں جکڑ لیں یا بُت پرستی پر مجبور کریں تو مسلمانوں کو ان کے خلاف کارروائی کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا یا یہ کہ اگر خود مسلمانوں پر حملہ ہو جائے تو وہ امن پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموش تماشائی بن کر اپنی قوم کی تباہی اور بربادی کا منظر دیکھتے رہیں۔

جہاد فی سبیل اللہ اور اس کے مقاصد

اسلامی ماخذ میں عموماً جہاد کا لفظ 'فی سبیل اللہ' کے الفاظ کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کی تکمیل، مملکت میں توسیع، خسروی عزائم، مالِ غنیمت کی دستیابی اور

ایسے ہی دوسرے مقاصد کے لیے جہاد کرنا بے معنی ہے۔ جہاد کا مقصد ہر حالت میں خوشنودیٔ الٰہی ہونا چاہیے اور اس میں ذاتی، مادّی اور خود غرضی پر مبنی مفادات کی ملاوٹ قطعاً جائز نہیں۔

اسلامی جہاد کے مقاصد کا خلاصہ مندرجہ ذیل نکات میں دیا جا رہا ہے۔ ان نکات پر بحث کرتے ہوئے ہم مخالفین کے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش بھی کریں گے۔

صحیح نظام کے وجود کا دفاع

اسلامی جہاد کا اہم ترین مقصد حق اور انصاف کے الٰہی نظام کا دفاع اور اس کے نمایاں خدوخال کی نگہداشت ہے۔ رسولِ اکرم ؐ کے زمانے میں اکثر و بیشتر جنگیں اسی مقصد کے لیے لڑی گئیں۔

قرآن مجید بالصراحت فرماتا ہے:

"جن لوگوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا گیا ہے اُنھیں لڑنے کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ اُن کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے اور یقیناً اللہ اُن کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ وہ جنھیں ان کے گھروں سے بلاجواز نکال دیا گیا کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا معبود ہے اور اگر اللہ بعض لوگوں کو دوسروں کے ذریعے پسپا نہ کر دیتا تو بلاشبہ خانقاہیں اور یہودیوں کے معبد اور مجوسیوں کے مندر اور مسجدیں جہاں اکثر اللہ کا نام لیا جاتا ہے ویران ہو گئی ہوتیں۔"

لہٰذا جب کبھی مسلمانوں کی ملّی حکومت، آزادی اور سالمیت کو خطرہ

لاحق ہوجائے ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ دشمنوں کے مقابلے میں صف آرا ہوجائیں اور آخری دَم تک اپنا دفاع کریں۔ یہ امر قابلِ توجّہ ہے کہ اس آیتِ مبارکہ میں تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کا ذکر کیا گیا ہے جو بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام ایک امن پسند دین ہے۔

تاہم اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ اسلام بُت پرستی کو ہرگز برداشت نہیں کرتا۔ وہ نہ تو بُت پرستی کو کوئی مذہب سمجھتا ہے اور نہ ہی بُت خانوں کو عبادت گاہوں کا رتبہ دیتا ہے۔ اس کی نظر میں بُت پرستی محض ایک وہم، جھوٹ، فکری انحطاط اور ایک ایسی بیماری ہے جس کا جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے بُت خانوں کو تباہ و برباد کردینے کی اجازت دی ہے۔

مخالف عناصر کے خلاف جنگ

ایک نئے نظریے کی حیثیت سے ایک آسمانی نظام کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اسے تبلیغ کی آزادی میسّر ہو اور وہ فطری انداز سے وعظ و نصیحت کے ذریعے پھیل سکے۔ اگر چند عناصر مثلاً بت پرست اس نئے نظریے کو اپنے ناجائز مفادات کے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوجائیں اور اس کی اشاعت کو روکنے اور لوگوں کو گمراہی میں مبتلا رکھنے کی کوشش کریں اور اس کشمکش کا کوئی پُرامن حل ممکن نہ ہو تو اسلام مسلمانوں کو ایسے عناصر کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ تاریخِ اسلام کے ابتدائی دَور کی کچھ جنگیں جن کی جانب مذکورہ بالا قرآنی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اِسی نوعیت کی تھیں۔ چنانچہ

اسلامی جہاد کا ایک اور مقصد تبلیغ کی آزادی اور حقیقی نظام کا فطری پھیلاؤ ہے۔

ناانصافی اور فساد سے مبارزہ

اسلام ناانصافی اور فتنہ وفساد کا جانی دشمن ہے اور ان سے کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیّار نہیں لہٰذا جب اِن بُرائیوں کے سدِّباب کا کوئی پُرامن راستہ باقی نہ رہے تو وہ اُن کے خاتمے اور بیکس لوگوں کو مکّہ کے سودخوروں جیسے ظالموں کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے جہاد کی اجازت دیتا ہے۔

بلاشبہ اسلام نے ابتدا میں جو لڑائیاں لڑیں ان کی ایک نوعیت یہ بھی تھی۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

"تم ان بیکس مَردوں، عورتوں اور بچّوں کی خاطر فی سبیل اللہ جہاد کیوں نہ کرو جن پر تشدّد کیا گیا ہے اور جو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں: یا پروردگار! ہمیں اس مسکن سے نجات دلا جس کے باشندے ظالم وجابر ہیں اور اپنی رحمت سے ہمارے لیے اپنی طرف سے ایک محافظ اور معاون بھیج"۔[1]

جہاد کے لیے آمادگی

جب تک بین الاقوامی تعلّقات میں جبر اور قوّت کا راج ہے اور اسلامی معاشرے پر دشمنوں کے حملے کا امکان موجود ہے اسلام مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے دفاع کے لیے پوری طرح تیّار رہیں۔ قرآن مجید نے اِس بارے میں واضح ہدایات دی ہیں اور ایک مختصر لیکن جامع جملے میں اس موضوع پر سبھی کچھ فرما دیا ہے: "اور ان سے (یعنی دشمنوں سے)

مقابلہ کرنے کے لیے تم جس قدر قوّت فراہم کرسکتے ہو کرو۔"

گو جنگی سازوسامان کی فراہمی کے اخراجات کو بہت کم پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور انھیں غیر ترقیاتی تصوّر کیا جاتا ہے لیکن اسلام بوقتِ ضرورت نہ صرف یہ کہ ان اخراجات کو ضروری خیال کرتا ہے بلکہ انھیں مالی جہاد کا نام دیتا ہے۔

تاہم فوجی تیّاریوں اور جنگی سازوسامان کی فراہمی کے ذریعے دنیا سے جنگ اور جارحیت کا قلع قمع کرنا ممکن نہیں۔ بلاشبہ یہ تیّاریاں ضروری ہیں اور ان کا دفاعی پہلو بھی ہے تاہم یہی تیّاریاں بعض اوقات جنگ کے امکانات کو وسیع تر کردیتی ہیں۔ اسی بنا پر اسلام یہ تجویز کرتا ہے کہ دائمی امن کے حصول کا بنیادی ذریعہ ایمان اور اخلاق کو مضبوط کرنا ہے: "اے ایمان والو! تم سب امن میں داخل ہوجاؤ۔"

اس سے مراد یہ ہے کہ صلح اور امن سے بہرہ ور ہونے کا واحد راستہ یہی ہے کہ سب لوگ ایمان، نیکی اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے اقرار کی مملکت میں داخل ہوجائیں۔

یہی وہ مملکت ہے جس میں داخل ہوکر ہر شخص دوسرے کو اپنا بھائی تصوّر کرتا ہے۔ اس کا احترام کرتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ سبھی اللہ کے بندے ہیں اور وہ سبھی کو چاہتا ہے۔

یہی وہ مملکت ہے جس میں ہر شخص کے لیے لازم ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے مفادات کی طرح دوسروں کے مفادات کا بھی خیال رکھّے اور جو چیز اپنے لیے پسند کرتا ہو وہ دوسروں کے لیے بھی پسند کرے اور جس چیز کو اپنے لیے ناپسند کرتا ہو اسے دوسروں کے لیے بھی ناپسند کرے۔ یہی وہ مقام ہے

جس پر اللہ کی راہ میں اور اسی ذاتِ اقدس کی خاطر بُردباری اور ایثار کو بہترین انسانی فضائل سمجھا جاتا ہے۔

دشمن سے معاملہ کرتے ہوئے انسانی قواعد وضوابط کی پابندی

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کا دشمن ہونا اس امر کی کافی دلیل ہے کہ اس کے ساتھ ہر قسم کی زیادتی اور غیر انسانی سلوک روا رکھا جائے۔ تاہم اسلام اپنی مفصّل، عادلانہ اور پائدار تعلیمات کے ذریعے اس بارے میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا کہ انسان کو دشمن سے تصادم کے سلسلے میں بھی انسانی حُسنِ عمل کے قواعد وضوابط کی حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئیے کیونکہ ان قواعد سے معمولی سا انحراف بھی اللہ تعالیٰ کی مقرّر کردہ حدُود کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔

اسلامی سپاہ اور مجاہدین کے میدانِ کارزار کی جانب روانہ ہونے سے پہلے رسولِ اکرمؐ انھیں مندرجہ ذیل واضح ہدایات دیا کرتے تھے جن سے اسلام کے صلح جویانہ مزاج اور آنحضرتؐ کی بے مثال بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے:

"اللہ کا نام لے کر بڑھو اور اُسی سے مدد طلب کرو۔ اُسی کی خاطر اُس کے احکام کے مطابق جنگ کرو۔"

"دھوکے اور فریب کا ارتکاب نہ کرو۔ مالِ غنیمت خورد بُرد نہ کرو۔ جب دشمن مارا جائے تو اُس کی لاش کو مسخ نہ کرو۔ عورتوں، بچّوں اور بوڑھوں کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ جو راہب اور تارک الدنیا اشخاص خانقاہوں

اور غاروں میں قیام پذیر ہوں اُن سے تعرّض نہ کرو۔ بلا جواز درخت نہ کاٹو۔ دشمن کے کھجور کے باغات کو نہ تو جلاؤ اور نہ اُنھیں پانی میں غرق کرو۔ پھل دار درختوں کو تلف نہ کرو اور نہ ہی دشمن کی فصلوں کو نذرِ آتش کرو۔ اپنی خوراک کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے دشمن کے کار آمد جانوروں کو ذبح نہ کرو۔ پانی کو زہر آلود نہ کرو۔ فریب دہی سے اجتناب برتو اور دشمن پر اچانک شب خون نہ مارو۔"

اسلام جنگ کے غیر انسانی طریقوں مثلاً شب خون، جراثیمی جنگ، مویشیوں، فصلوں اور باغات کو نذرِ آتش کرنے اور غیر مسلّح افراد کو قتل کرنے یا تکلیف پہنچانے کی ممانعت کرتا ہے۔ جنگ کے اسلامی قواعد و ضوابط میں بار بار یہ ہدایت کی گئی ہے کہ مسلمان پہلا تیر ہرگز نہ چلائیں اور نہ ہی حملے میں پہل کریں۔ دوسرے الفاظ میں جب تک اُن پر حملہ نہ کیا جائے وہ دشمن پر حملہ نہ کریں اور جارحانہ نہیں بلکہ مدافعانہ جنگ لڑیں۔

روایات سے پتا چلتا ہے کہ امیر المومنین امام علی علیہ السّلام ہدایات دیا کرتے تھے کہ اس امر کی کوشش کرنی چاہیئے کہ جنگ دوپہر سے پہلے شروع نہ ہو اور اگر ممکن ہو تو اُسے سہ پہر تک ملتوی کر دیا جائے۔ مراد اس سے یہ تھی کہ جنگ کی ابتدا کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو سورج ڈوب جائے اور چونکہ مغرب کے بعد جنگ عموماً بند کر دی جاتی ہے اس لیے کم سے کم کشت و خون ہو۔

پیشوایانِ اسلام (ائمہؑ علیہم السّلام) نے اسیرانِ جنگ سے سلوک کے بارے میں جو ہدایات دی ہیں وہ اس امر کا ایک اور بیّن ثبوت ہیں کہ اسلام کی رُو سے دشمن کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے انسانی حُسنِ سلوک کے ضوابط کی پابندی لازمی ہے۔ اسیرانِ جنگ سے نیک سلوک کی تاکید

کی گئی ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ انھیں وہی خوراک دی جائے جو مسلمان خود استعمال کرتے ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی معاشرے میں صحیح تربیت اور زندہ روحِ ایمان اور انسانی اخلاق کی موجودگی بہت سی زیادتیوں اور خرابیوں کا سدِّ باب کر دیتی ہے۔ تاہم ایک قوی اور آزاد عدلیہ کے بغیر سماجی انصاف کا قیام اور استحکام ممکن نہیں۔ ہر معاشرے میں کچھ ایسے شریر اور سرکش لوگ موجود ہوتے ہیں جن کی رُوح کی تیرگی محض ایمان اور اخلاق کی روشنی سے دُور نہیں ہو سکتی۔ ایسے لوگوں کو ایک مضبوط اور غیر جانبدار عدلیہ کے بغیر زیر کرنا ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنا سماجی انصاف کا پروگرام نافذ کرنے کے لیے محض وعظ و نصیحت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی تعلیمات کی تائید کے لیے ایک مضبوط عدلیہ کی تشکیل کا اہتمام بھی کیا ہے۔

اسلام کا عدالتی نظام

ایک قاضی (جج یا مجسٹریٹ) میں جو صفات ہونی چاہئیں اُن میں سے دو سب سے زیادہ اہم ہیں:

(۱) اُسے قوانین و ضوابط کا پورا پورا علم ہونا چاہیئے۔

(۲) اُسے انصاف، نیکی اور راستبازی کا مظہر ہونا چاہیئے۔

جہاں تک عدالت کے روبرو برابری کا تعلّق ہے اسلام قاضی کو حکم دیتا ہے کہ وہ مقدمے کے فریقین سے یکساں برتاؤ کرے۔ اُس کے لیے لازم ہے کہ عام اخلاقی افعال مثلاً فریقین سے گفتگو یا ان کی جانب

توجّہ یا اُنھیں بیٹھنے یا کھڑا ہونے کا حکم دینے کے بارے میں بھی اُن سے ایک جیسا سلوک کرے۔ فریقینِ مقدمہ کی سماجی حیثیت کی بنا پر اُن سے کوئی جانبدارانہ سلوک کرنے کی اجازت نہیں۔

پیشوایانِ اسلام (ائمۃ علیہم السّلام) کے ارشادات کے مطابق قاضی کا عہدہ بڑی اہمیّت اور ذمّے داری کا حامل ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ پُرخطر بھی ہے۔ اس کی ہلکی سی لغزش بھی اُسے اس اہم عہدے کے لیے نااہل بنا دیتی ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ایک قاضی کی زبان کا مقام دو شعلوں کے درمیان ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ کسی فریقِ مقدمہ سے جانبداری برتے تو آگ اس کا مقدّر بن جاتی ہے۔

اسلام میں رشوت لینا اور پھر مقدمے کی غلط تعبیر کرتے ہوئے فیصلہ رشوت دینے والے کے حق میں کرنا کبیرہ گناہ ہیں۔ رسولِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے: رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا اور اُن کے مابین دلالی کرنے والا سب دوزخ میں جائیں گے"۔

اسلام کا عدالتی نظام بڑا اچھا تُلا اور مفصّل ہے اور دنیا کے موجودہ عدالتی نظاموں میں اس کا ایک خاص مقام ہے۔

اسلامی فقہ کی کتابوں میں ایک باب نظامِ عدالت کے لیے مخصوص ہے اس باب میں عدالتی بندوبست کے قواعد وضوابط، قاضی کی استعداد اور گواہوں کی اہلیت کی شرائط، مقدمہ دائر کرنے کے طریقے، وہ دلائل جو فریقین اپنے دعوے کی تائید میں دینے کے مجاز ہیں اور ایسے ہی دوسرے عنوانات سے بحث کی گئی ہے۔

امام علی علیہ السّلام نے والیٔ مصر مالک اشتر کے نام اپنے خط میں جو ہدایات رقم فرمائیں ان سے مذکورہ بالا نکات میں سے کئی ایک پر روشنی پڑتی ہے اور یہ پتا چلتا ہے کہ اسلام میں قاضی کے معزّز عہدے کی کتنی بڑی اہمیت ہے۔ اس موضوع پر اِس کتاب کے چھٹے باب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

فوجداری قوانین

مجرموں کو جو سزا دی جائے وہ انصاف پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہونی چاہیئے۔ علاوہ ازیں اس بات کی گنجائش بھی ہونی چاہیئے کہ جو مجرم اپنے کیے پر نادم ہوں یا جنھوں نے نادانی یا ناتجربہ کاری کی بِنا پر جرُم کا ارتکاب کیا ہو اُن کی سزا میں تخفیف ہو سکے۔ اسلام کی تجویز کردہ سزائیں ان تینوں پہلوؤں پر محیط ہیں۔ مثلاً قتلِ عمد کے لیے مقرّر شدہ سزا مَوت ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے: "اے جاننے والے لوگو! قانونِ انتقام میں تمھارے لیے جان کی سلامتی ہے"۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید مقتول کے ورثاء کو اس امر کی اجازت بھی دیتا ہے کہ وہ قاتل کو معاف کردیں اور اس سے دیئت حاصل کرلیں۔

اسی طرح عصمت کے خلاف بعض جرائم کی صورت میں اگر مجرم عدالت کے سزا کا حکم سنانے سے پہلے صدقِ دل سے توبہ کرلے اور ہرجانہ دینے پر آمادہ ہو تو اُسے معاف کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق جرائم کا قلع قمع کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تمام تر کوششیں لوگوں کی اخلاقی تربیت پر مرکوز کردی جائیں تاکہ انھیں ہر وقت قیامت کے دن ملنے والی

جزا اور سزا کا احساس رہے۔
تاہم اگر ان کوششوں کے باوجود جرائم کا ارتکاب ہو تو پھر اس صورتِ حال سے سختی سے نمٹنا چاہیے۔ اسلام ان لوگوں کے خلاف ہے جو خام جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور قتل کے لیے سزائے موت اور دُوسرے جرائم کے لیے شرع کی مقرر کردہ سزاؤں کو نامناسب خیال کرتے ہیں۔ فی الحقیقت اس قسم کے لوگ مجرموں کے مفادات کو معاشرے کے مفادات پر ترجیح دیتے ہیں۔
تجربہ شاہد ہے کہ عادی مجرموں سے نرمی برتنے کا نتیجہ فتنہ و فساد کے پھیلاؤ کی صورت میں نکلتا ہے اور یہ کیفیت یقیناً معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے بے حد مضرت رساں ہے۔
ممکن ہے بعض لوگ اسلام کے فوجداری قانون کی کچھ شقوں پر اعتراض کریں اور انھیں بے حد سخت قرار دیں لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ سخت سزائیں فقط سنگین جرائم کے لیے دی جاتی ہیں اور وہ بھی اس وقت جب ان جرائم کی وجہ سے معاشرے کی اخلاقی اور سماجی سلامتی خطرے میں پڑ جائے۔ اس قسم کی مثالیں دوسرے تعزیراتی قوانین میں بھی ملتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ کچھ معاشرے جنسی بے راہ روی کی روک تھام کو کوئی اہم مسئلہ نہ سمجھتے ہوں جبکہ اسلام اپنی دقیقہ سنج بصیرت کی بدولت اسے بے حد اہمیّت دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے دستوری نظام بعض اور مسائل کو اہم گردانتے ہوں۔
گو چند اسلامی سزائیں بعض اوقات بہت کڑی معلوم ہوتی ہیں لیکن متعلّقہ جرائم کا ثابت کرنا اتنا مشکل ہے اور اس سے اتنی سخت شرائط وابستہ ہیں کہ سال بھر میں بہ مشکل ایک یا دو ایسے مجرم سزایاب ہوتے ہیں۔ لہٰذا

گو ان سزاؤں کی شدید نوعیت کا لوگوں پر بڑا خاطر خواہ اثر ہوتا ہے اور وہ متعلقہ جرائم کا ارتکاب کرتے ہوئے خوف کھاتے ہیں تاہم عملی طور پر ان سزاؤں کا اطلاق بہت کم لوگوں پر ہوتا ہے۔

یہ بات بھی واضح طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اسلامی قوانین اور دوسری اسلامی تعلیمات جن کا مقصد انسانی حقوق اور تعلقات کی حفاظت اور فتنہ و فساد اور جارحیت کی روک تھام ہے ایک مشابہ الاجزاء وحدت تشکیل دیتے ہیں اور اسی وقت حقیقی طور پر مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں جب ان کا نفاذ بیک وقت کیا جائے۔

سب سے پہلے ایک ایسا ماحول پیدا کرنا ضروری ہے جس میں اخلاقی تربیت اور رفاہِ عامّہ سے متعلق اسلامی تعلیمات کا نفاذ ہو سکے۔ ایسے ماحول میں جرائم کی تعداد میں معتد بہ کمی آجائے گی اور نتیجۃً سزا دینے کے مواقع بھی بہت کم رہ جائیں گے۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں زیادہ تر جرائم غلط تربیت اور مختلف مادّی اور معاشرتی محرومیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جب یہ عوامل ناپید ہو جائیں گے تو جرائم کی تعداد بھی لازمی کم ہو جائے گی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سزا پانے والوں کی تعداد رفتہ رفتہ گھٹتی جائے گی اور ساتھ ہی ساتھ بظاہر بہت سے اشخاص کو سخت سزائیں دیئے جانے کے متعلق لوگ جس کراہت کا اظہار کرتے ہیں اس میں بھی کمی آجائے گی۔ البتّہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر کسی مخصوص ماحول میں اخلاقی تربیت یا غربت کے سدِّ باب کے پروگرام کے کسی حصّے پر عملدرآمد نہیں ہو رہا تو باقی احکام اور تعلیمات

کو بھی کُلّیتہً نظر انداز کر دیا جائے۔ ہمارا مقصد صرف یہ بات ذہن نشین کرانا ہے کہ اسلامی پروگرام کی تمام شقیں آپس میں مربوط ہیں اور اگر ان پر بیک وقت عملدرآمد ہو تو بہترین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

باب ششم

اسلامی نظم ونسق کا بنیادی معیارِ عمل

صفحہ نمبر

اسلامی نظم و نسق
کا
بنیادی معیارِ عمل

مندرجہ ذیل ہدایات امام علی ابنِ ابی طالب علیہ السّلام نے ایک خط کی شکل میں حضرت مالک اشتر کو دیں جسے آپ نے ۶۵۷ء کے لگ بھگ مصر کا والی مقرّر فرمایا تھا۔ان تمام ہدایات میں ابتدا سے انتہا تک ایک مرکزی نکتہ اسی طرح موجود ہے جس طرح ایک واحد دھاگہ ہو اور اس سے سارا کپڑا بُن لیا جائے اور وہ نکتہ خدائے بزرگ و برتر کی ذاتِ اقدس ہے۔ حکومت اللہ ہی کی ہے اور والی ہوں یا رعایا سبھی اللہ کے بندے ہیں۔

اس خط کے مندرجات کی بنیاد قرآن مجید کے بتائے ہوئے نظم ونسق کے اصولوں پر ہے۔ یہ ایک کریم النفس اور فیض رساں حکومت کے قیام کا ضابطہ ہے جو انصاف، کرم گستری اور رحمدلی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ ایک ایسا دستور ہے جس کی بنیاد ایک شفیق اور صالح حکومت کے اصولِ اخلاق پر ہے جہاں طبقے، مسلک اور رنگ

کا امتیاز کیے بغیر انصاف اور شفقت پر مبنی برتاؤ کیا جاتا ہے۔ جہاں ناداری اور غربت کو نہ تو کوئی عیب سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی نااہلی تصوّر کیا جاتا ہے اور جہاں انصاف میں اقربا پروری، جانبداری، صوبہ پرستی اور مذہبی تعصّب کی آلائش نہیں ہوتی۔ ان باتوں کے برعکس یہ خط اعلیٰ اخلاقی قدروں کا ایک شاہکار ہے۔ ①

---

① معروف عرب مسیحی دانشور، ماہرِ قانون، شاعر اور فلسفی عبدالمسیح انطاکی جس کی وفات بیسویں صدی کی ابتدا میں واقع ہوئی، اس خط کے مندرجات پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کا پایہ حضرت موسیٰؑ اور حمورابی کے ضابطہ ہائے قوانین سے کہیں بلند ہے۔ یہ خط واضح کرتا ہے کہ انسانی نظم ونسق کی کیا شکل وصورت ہونی چاہیے اور اسے کس طرح چلانا چاہیے یہ مسلمانوں کے اس دعوے کی تائید کرتا ہے کہ اسلام دنیا میں ایک ایسا الٰہی نظام رائج کرنا چاہتا ہے جسے لوگ اپنی فلاح وبہبود کے لیے خود چلائیں۔ اسلام چاہتا ہے کہ حاکم اپنے آپ کو خوش رکھنے کے لیے نہیں بلکہ عامۃ الناس کی بہتری اور آسائش کے لیے حکومت چلائے۔ اسلام سے پہلے کسی اور دین نے یہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ امام علی علیہ السلام ان اصولوں کو اپنی حکومت میں رائج کرنے اور انھیں آئندہ نسلوں کی خاطر ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ایک مشہور مورّخ مسعودی کے مطابق (مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۳۳ مطبوعہ مصر) امام علیؑ نے فلسفہ، مذہب، قانون اور سیاست سے متعلّق ۴۸۰ معاہدات، خطبات اور مکتوبات یادگار چھوڑے ہیں جنھیں زید بن وہاب نے آپ کی زندگی میں ہی جمع کر لیا تھا۔ یہ تحریریں اپنے مندرجات اور ادبی خوبیوں کی وجہ سے اتنی گراں قدر ہیں کہ ان میں سے کچھ شاہکار اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں اسلامی علمی مراکز میں مطالعے کا موضوع رہے ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اے مالک! تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں تمھیں ایک ایسے ملک کا والی بنا کر بھیج رہا ہوں جس پر گزشتہ زمانوں میں انصاف پسند اور ظالم دونوں قسم کے لوگوں نے حکومت کی ہے۔ لوگ تمھارے اعمال کو اُسی طرح بنظرِ غائر جانچیں گے جس طرح تم خود اپنے آپ سے پہلے والوں کے اعمال جانچا کرتے تھے اور تمھارے متعلق ایسے ہی گفتگو کریں گے جیسے تم ان کے متعلق کیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ صرف اُنہی کی تعریف کرتے ہیں جو اچھّے کام کرتے ہیں۔ وہی ہیں جو تمھارے اعمال کا ثبوت مہیّا کرتے ہیں لہٰذا سب سے قیمتی خزانہ جس کی تمھیں خواہش کرنی چاہیے نیک اعمال کا خزانہ ہے۔ اپنی خواہشات پر قابو رکھو اور جن چیزوں سے تمھیں منع کیا گیا ہے اُن سے پرہیز کرو۔ اسی قسم کا تقویٰ اختیار کرنے سے تم نیک اور بد میں تمیز کر سکو گے۔

اپنے دل میں رعایا کے لیے محبّت کے جذبات پیدا کرو تاکہ یہ محبّت

یوں معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں آپ کی شہرت نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں پہنچی آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ایڈورڈ پاؤکاک (Prof. Edward Powcock) (۱۶۰۴ء تا ۱۶۹۱ء) نے سب سے پہلے آپ کے اقوال کا انگریزی ترجمہ شائع کیا اور ۱۶۳۱ء میں آپ کی خطابت کے موضوع پر کئی ایک لیکچر دیے۔

فہرستِ طوسی (صفحہ ۳۳) کے مطابق سب سے پہلے یہ خط اصبغ بن نباتہ نے

ان کے لیے شفقت اور رحمت کا ماخذ بن جائے۔ ان کے ساتھ وحشیانہ سلوک نہ کرو اور جو چیز ان کی ملکیت ہو اُسے اپنے تصرّف میں نہ لاؤ۔ یاد رکھّو کہ مملکت کے شہری دو قسم کے ہیں یا تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں اور یا ہم جنس ہونے کی حیثیت سے وہ تمھارے بھائی ہیں۔ ان میں کمزوریاں ہو سکتی ہیں اور وہ غلطیاں کر سکتے ہیں۔ ان میں سے کچھ غلطیاں کرتے بھی ہیں لیکن تمھیں چاہیے کہ انھیں اسی طرح معاف کر دو جس طرح تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمھیں معاف کر دے۔ یاد رکھّو کہ تمھیں ان پر اسی طرح متعیّن کیا گیا ہے جس طرح مجھے تم پر متعیّن کیا گیا ہے اور پھر جس نے تمھیں والی کا عہدہ دیا ہے تاکہ تم لوگوں کا خیال رکھو اور ان کے لیے کفایت کرو اس کے اوپر اللہ بھی ہے۔

یاد رکھّو! تمھاری سیرت کا اندازہ اسی سے لگایا جائے گا جو تم ان کے لیے کرو گے۔

اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے خلاف مت کھڑا کرو کیونکہ نہ تو تم اپنے آپ کو اُس کے غضب سے بچانے کی طاقت رکھتے ہو اور نہ ہی اُس کے رحم اور عفو کے دائرے سے باہر لے جا سکتے ہو۔ اگر عفو و درگزر سے

امام علی علیہ السلام کے زمانے میں نقل کیا۔ بعد میں مختلف عرب اور مصری دانشوروں نے اسے اپنی تصانیف میں نقل کیا اور اس کے حوالے دیے۔ ان اہلِ علم میں سے مندرجہ ذیل بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔

نصر بن مزاحم (۱۴۸ ہجری)، جاحظ بصری (۲۵۵ ہجری)، سیّد رضی (۴۰۴ ہجری) ابن ابی الحدید (۶۵۵ ہجری)، ابنِ عبدہ (مصلح مصر) اور علاّمہ مصطفیٰ بیگ نجیب جو

کام لو تو اس پر افسوس نہ کرو اور اگر کسی کو سزا دو تو اس پر خوش نہ ہو۔ طیش میں مت آؤ کیونکہ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

یہ مت کہو: "میں تمہارا فرمانروا اور مطلق العنان حاکم ہوں اور تمہارے لیے لازم ہے کہ میرے احکام کے آگے سر جھکا دو۔" کیونکہ ایسا کرنے سے تمہارا ذہن آلودہ ہو جائے گا۔ دین میں تمہارا ایمان کمزور ہو جائے گا اور مملکت میں انتشار پیدا ہوگا۔ اگر تم طاقت سے بدمست ہو جاؤ یا اپنے دل میں معمولی سا تکبر اور گھمنڈ بھی محسوس کرو تو کائنات کی الٰہی حکومت کی طاقت اور شان و شوکت کے بارے میں غور کرو جس پر تمہارا قطعاً کوئی اختیار نہیں ہے۔ ایسا کرنے سے تمہارے گمراہ ذہن میں توازن پیدا ہو جائے گا اور تمہیں خوش خلقی اور سکون حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی شان و شوکت کا مقابلہ کرنے کی ہرگز کوشش نہ کرو اور اس کی قدرتِ مطلقہ کی نقل مت اتارو کیونکہ اللہ ہر شخص کو جو اس سے بغاوت کرتا ہے اور جو اس کے بندوں پر جبر کرتا ہے خوار اور زبوں کر دیتا ہے۔

ضروری ہے کہ تمہارا دل تمہارے اعمال کے ذریعے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا احترام کرے اور تمہیں چاہیئے کہ اپنے اعزا اور ساتھیوں کو بھی

جو مصر کے عظیم ترین دانشور تھے۔

مؤخر الذکر نے اس خط کو اسلامی نظم و نسق کا بنیادی معیارِ عمل قرار دیا ہے۔

ایک فرانسیسی مورخ یوں رقمطراز ہے: "اگر آپ (امام علیؑ) شہید نہ کر دیے جاتے تو ممکن تھا کہ ملتِ اسلامیہ تعقل اور قانون کے حقیقی امتزاج اور فلسفے کے صحیح اصولوں اور مثبت اقدامات کی شکل میں رسولِ اکرمؐ کی تعلیمات کو بار آور ہوتا دیکھ لیتی۔ علم و فضل کی

ایسا ہی کرنے پر آمادہ کرو کیونکہ بصورتِ دیگر تم خود اپنے آپ پر بھی اور انسانیت پر بھی ظلم کروگے اور نتیجتاً انسان اور اللہ تمھارے خلاف ہو جائیں گے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو اپنا مخالف بنالے اُس کی کہیں شنوائی نہیں ہوتی اور جب تک وہ پشیمان نہ ہو اور توبہ نہ کرلے اس کی حیثیت ایک ایسے شخص کی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ سے برسرِ پیکار ہو۔ ظلم کے علاوہ کوئی چیز انسان کو اللہ کی رحمت سے محروم نہیں کرتی اور نہ ہی کوئی چیز اتنی جلدی اللہ کو غضبناک کرتی ہے جتنی جلدی ظلم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مظلوم کی فریاد سُنتا ہے اور ظالم کا راستہ روکتا ہے۔

عامّۃ الناس

نظم ونسق میں انصاف برتو اور اِسے اپنے آپ پر بھی عائد کرو۔ لوگوں کی رضامندی حاصل کرو کیونکہ عوام کی بے چینی چند مراعات یافتہ اشخاص کے اطمینانِ خاطر کو فنا کر دیتی ہے اور چند اشخاص کی بے چینی بہت سے لوگوں کے اطمینان میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ یاد رکھو چند مراعات یافتہ اشخاص مشکل حالات میں ہرگز تمھارے گرد جمع نہ ہوں گے۔ وہ انصاف کو ٹالنے کی کوشش کریں گے۔ وہ اپنے

جس پُرخلوص چاہت نے حضرت محمدؐ کو سب لوگوں میں ممتاز کر رکھا تھا وہی چاہت آپ کے شاگرد کے ہر لفظ سے مترشّح تھی۔ آپ اپنے زمانے کے معیار کے مقابلے میں کہیں زیادہ فراخدل تھے اور آپ کی یہ فراخدلی خلوصِ نیت اور قوّتِ ایمانی سے مربوط تھی۔ آپ کے خطبات (جو آپ کے اخلاف میں سے ایک صاحب نے بڑی صحت سے جمع کیے ہیں) اور مناجاتیں تمام بھلائیوں کے ماخذ (اللہ تعالیٰ) کی جانب پُرخلوص توجّہ اور انسانیت پر کامل اعتماد کا مظہر ہیں۔

(اسپرٹ آف اسلام۔ سیّد امیر علی۔ صفحہ ۳۶۳)

استحقاق سے کہیں زیادہ طلب کریں گے اور جو احسانات اُن پر کیے جائیں گے ان کے لیے ہرگز شکرگزار نہ ہوں گے۔ آزمائش کی گھڑیوں میں وہ سرکشی اختیار کریں گے اور اپنی کوتاہیوں پر اظہارِ ندامت نہیں کریں گے۔ یہ عام انسان ہی ہے جو مملکت اور دین کے لیے موجبِ قوّت ہے۔ وہی دشمن سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ پس عوام الناس سے قریبی رابطہ رکھّو اور ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھّو۔

جو شخص دوسروں کی کمزوریاں ظاہر کرے اُسے مُنہ نہ لگاؤ۔ آخر عوام کمزوریوں سے مبرّا تو نہیں ہیں۔ حاکم کا فرض ہے کہ ان کی حفاظت کرے۔ جو چیز پوشیدہ ہو اُسے ظاہر نہ کرو لیکن جن کمزوریوں کا پتا چل جائے انھیں دُور کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ تعالیٰ ہر اُس چیز کو دیکھتا ہے جو تمھاری نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور اس کا معاملہ وہی طے کرے گا۔ جہاں تک ممکن ہو عوام کی کوتاہیوں کی پردہ پوشی کرو تاکہ اپنی جن کوتاہیوں کو تم لوگوں کی نظروں سے اوجھل رکھنا چاہتے ہو اللہ تعالیٰ اُن کی پردہ پوشی فرمائے۔ لوگوں کے خلاف نفرت کی ہر گرہ کھول دو اور ان کے مابین عداوت کی ہر رسّی کاٹ دو۔ اپنے آپ کو ہر اُس فعل سے بچاؤ جو تمھارے لیے قطعاً مناسب نہ ہو۔ چُغلی کی تصدیق کے لیے عجلت مت کرو کیونکہ چُغل خور ایک دھوکے باز شخص ہوتا ہے جو اپنے آپ کو دوست کے بھیس میں پیش کرتا ہے۔

مشیر

کنجوس شخص سے مشورہ مت طلب کرو کیونکہ وہ تمھاری کریم النّفسی کو بے اثر بنا دے گا اور تمھیں ناداری کا خوف دلائے گا۔ بُزدل شخص سے بھی

مشورہ نہ لو کیونکہ وہ تمھارے ارادوں کو متزلزل کر دے گا حریص لوگوں سے بھی صلاح مشورہ نہ کرو کیونکہ وہ تمھارے دل میں حرص پیدا کر کے تمھیں ظالم بنا دیں گے۔ کنجوسی، بُزدلی اور حرص انسان کو ایمان باللہ سے محروم کر دیتی ہیں۔

بدترین مشیر وہ ہے جو اس سے پہلے ظالم حکّام کا مشیر اور ان کے مظالم میں شریک رہ چکا ہو لہٰذا جو اشخاص ظالموں کے ساتھی اور اُن کے جور و ستم میں حصّے دار رہے ہوں انھیں مشیر مت بناؤ۔ تمھیں اُن سے کہیں بہتر لوگ دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگ جو عقلمند اور دُور اندیش ہوں، جن کا دامن گناہوں سے آلودہ نہ ہو اور جنھوں نے کبھی کسی آمر کی اُس کے جور و جفا میں یا مجرم کی اس کے جرائم میں اعانت نہ کی ہو۔ ایسے لوگ تمھارے لیے کبھی بوجھ ثابت نہ ہوں گے۔ اِس کے برعکس وہ ہمیشہ تمھارے لیے مدد اور قوّت کا موجب بنیں گے۔ وہ تمھارے دوست اور تمھارے دشمنوں کے لیے غیر ہوں گے۔ نجی اور عام محفلوں میں تم اپنی مصاحبت کے لیے فقط ایسے ہی لوگوں کا انتخاب کرو۔ ان میں سے بھی ایسے لوگوں کو فوقیت دو جو عادتاً سچّائی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوں خواہ ان کا سچ بولنا بعض اوقات تم پر گراں ہی کیوں نہ گزرے اور جو ایسے رجحانات کے اظہار کے لیے تمھاری ہمّت افزائی نہ کریں جنھیں اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں میں دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔

راستباز اور خداترس لوگوں کے قریب رہو اور اُن پر واضح کر دو کہ وہ کبھی تمھاری خوشامد نہ کریں اور نہ ہی کوئی ایسا اچھّا کام تم سے منسوب کریں جو تم نے نہیں کیا کیونکہ خوشامد روا رکھنا اور غیر ضروری

تعریف انسان میں غرور کا جذبہ ابھارتی ہیں اور اُسے خود رائے بنادیتی ہیں۔

اچھے اور بُرے لوگوں سے یکساں سلوک نہ کرو کیونکہ ایسا کرنے سے اچھے لوگوں کی اچھے کام کرنے سے حوصلہ شکنی ہوگی اور بُرے لوگوں کو اپنی برائیاں جاری رکھنے کی جسارت ہوگی۔ ہر ایک کو وہی صلہ دو جس کا وہ سزاوار ہو۔ یاد رکھو کہ حاکم اور رعایا کے درمیان باہمی اعتماد اور خیر خواہی کریم النفسی، انصاف اور خدمت کی بدولت ہی پروان چڑھتی ہے لہٰذا لوگوں کے دلوں میں خیر خواہی کا جذبہ پیدا کرو کیونکہ فقط ان کی خیر خواہی تمھیں مصائب سے محفوظ رکھے گی۔ تمھارے کریمانہ برتاؤ کے جواب میں وہ تم پر اعتماد کریں گے اور تمھاری بدسلوکی اُن کے دلوں میں عداوت پیدا کرے گی۔

ہمارے اجداد کی قائم کردہ ان روایات کو نظر انداز نہ کرو جو لوگوں کی ترقی اور ان کے مابین ہم آہنگی کا موجب بنی ہیں اور کوئی ایسی چیز شروع نہ کرو جو ان روایات کی افادیت میں کمی کا باعث ہو۔ جن لوگوں نے یہ عالی روایات قائم کیں انھیں ان کا بدلہ مل چکا ہے اور اگر انھیں رَد کر دیا گیا تو ذمّے داری تمھاری ہوگی۔ ہمیشہ اہلِ علم و دانش کے تجربات سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کرو اور امورِ مملکت میں اکثر و بیشتر ان سے مشورہ لو تاکہ تم اس امن و امان اور نیک اندیشی کو برقرار رکھ سکو جو تمھارے آباؤ اجداد نے اس علاقے میں قائم کی تھی۔

لوگوں کے مختلف طبقات

یاد رکھو کہ لوگ مختلف طبقوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان طبقوں میں سے ہر ایک کی ترقی کا انحصار دوسرے کی ترقی پر ہوتا ہے اور ان میں سے کوئی

بھی ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ہمارے پاس اللہ کے سپاہیوں سے تشکیل شدہ فوج ہے۔ ہمارے سول افسر اور ان کے دفاتر ہیں۔ ہماری عدلیہ، مال اور تعلّقاتِ عامّہ کے افسر ہیں۔ ہمارے عوام بھی مسلمانوں اور ذمّیوں پر مشتمل ہیں اور ان میں تاجر، کاریگر، بے روزگار اشخاص اور نادار لوگ شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے متعدّد حقوق، وظائف اور ذمّے داریاں مقرّر فرمائی ہیں۔ یہ سب چیزیں اللہ کی کتاب اور احادیثِ رسولؐ میں معیّن اور محفوظ کر دی گئی ہیں۔

اللہ کی مہربانی سے فوج، لوگوں کے لیے ایک قلعے کی حیثیت رکھتی ہے اور مملکت کو وقار بخشتی ہے۔ یہ دین کا وقار بلند کرتی ہے اور ملک میں امن قائم رکھتی ہے۔ اس کے بغیر مملکت کا قائم رہنا ممکن نہیں اور اسی طرح یہ (یعنی فوج) بھی حکومت کی مدد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سپاہیوں پر اُس کی خاطر لڑنے کی وجہ سے جو لطف و کرم فرمایا تھا اس کی بدولت وہ دشمن کے مقابلے میں طاقتور ثابت ہوئی ہیں لیکن ان لوگوں کی بھی کچھ مادّی ضروریات ہیں جنھیں پورا کرنے کے لیے اُنھیں اُن رقوم پر انحصار کرنا پڑتا ہے جو انھیں بیت المال سے ملتی ہیں۔

فوج کو بھی اور سول آبادی کو بھی جو کہ مالیہ ادا کرتی ہے دوسروں یعنی عدلیہ، سول افسران اور ان کے عملے وغیرہ کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ قاضی، دیوانی اور فوجداری قانون کا نفاذ کرتا ہے۔ سول افسر مالیہ وصول کرتے ہیں اور اپنے عملے کی مدد سے مملکت کا نظم و نسق چلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ سوداگر اور تجارت پیشہ لوگ بھی ہیں جو ملک کے مالیے میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو منڈیوں کا کاروبار چلاتے ہیں اور معاشرتی

ذمّے داریاں پوری کرنے کے لیے دوسروں کے مقابلے میں بہتر پوزیشن میں ہیں۔ پھر فقراء اور مساکین کا طبقہ ہے جن کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمّے داری دوسرے طبقوں پر عائد ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو خدمت کا مناسب موقع دیا ہے۔ اس کے بعد ان تمام طبقوں کے حقوق انتظامیہ کے ذمّے ہیں جن کی ادائیگی منتظم کو ساری آبادی کی فلاح وبہبود کا خیال رکھتے ہوئے کرنی ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جس سے وہ اس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس معاملے میں ذاتی دلچسپی نہ لے اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب نہ کرے۔ بلاشبہ اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے آپ پر یہ ذمّے داری عائد کرے اور اس سلسلے میں جو پریشانیاں اور مشکلات درپیش ہوں انھیں صبر وتحمّل سے برداشت کرے۔

فوج

فوج میں شامل لوگوں میں سے ان اشخاص کی فلاح وبہبود کا خاص طور سے خیال رکھو جو تمھاری رائے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے پورے پورے وفادار ہوں۔ غیظ کے عالم میں اپنے آپ پر قابو پاسکیں۔ جائز شکایت کو ٹھنڈے دل سے سنیں۔ ضعیفوں کی آڑے وقت پر مدد کرسکیں اور زبردستوں کو ضرب لگاسکیں۔ ایسے اشخاص جنھیں شدید اشتعال انگیزی مغلوب الغیظ نہ کردے اور جو کسی مرحلے پر بھی لڑکھڑا نہ جائیں۔

ایسے خاندانوں سے قریبی رابطہ قائم رکھّو جن کی شہرت اور دیانت مسلّمہ اور ماضی شاندار ہو۔ ایسے لوگوں کو اپنی جانب راغب کرو جو بہادر، باکردار، سخی اور کریم النّفس ہوں کیونکہ ایسے لوگ ہی معاشرے کے منتخب

افراد ہوتے ہیں۔

ان لوگوں سے ایسی ہی شفقت برتو جیسی تم اپنی اولاد سے برتتے ہو اور اگر تم نے ان پر کوئی احسان کیا ہو تو اُس کا ذکر ان کے سامنے مت کرو۔ نہ ہی اس اظہارِ محبّت کو نظر انداز کرو جو وہ اس کے جواب میں کریں کیونکہ یہی وہ روش ہے جو وفاداری، خلوص اور خیر خواہی کو جنم دیتی ہے۔ تم نے عام طور پر ان کی جو مدد کی ہو اُسی پر اکتفا نہ کرو بلکہ ان کی ہر چھوٹی موٹی ضرورت کا بھی خیال رکھو کیونکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کی کسی معمولی سی ضرورت کی جانب بروقت توجّہ دینے سے اُنھیں کافی تسکین مل جاتی ہے۔ بلاشبہ جب کبھی تم پر مشکل وقت آن پڑے گا تو یہ لوگ تمھیں نہیں بھُلائیں گے۔

اپنے سپہ سالار کے طور پر ایسے شخص کا انتخاب کرو جو اپنے جوانوں کی مدد کرنا اپنا فریضہ تصوّر کرتا ہو۔ وہ ایسا شخص ہونا چاہیئے جو مہر و محبّت میں ان تمام افسروں پر سبقت لے جا سکتا ہو جو اپنے ماتحتوں کی ضروریات کا خیال رکھنے کے ذمّے دار ہوں اور جب وہ اپنے گھروں سے دُور ہوں تو ان کے اہلِ خاندان کا خیال رکھے حتّیٰ کہ تمام سپاہی اپنی مسرّتوں اور آلام میں اپنے آپ کو ایک دوسرے کا شریک سمجھیں۔ مقصد کی یگانگت دشمن کے مقابلے میں ان کی قوّت میں اضافے کا موجب بنے گی۔ ان کے ساتھ ہمیشہ حُسنِ سلوک روا رکھو تاکہ وہ ہمیشہ تمھارے ساتھ وابستہ رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ منتظمین کی خوشی اور ان کی خوشگوار ترین آسائش مملکت میں انصاف قائم کرنے اور لوگوں سے شفقت آمیز تعلّقات رکھنے میں مضمر ہے۔ ان کے خلوص کا اظہار اس محبّت اور احترام سے ہوتا ہے جو وہ تمھارے لیے روا رکھتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس پر انتظامیہ کی سلامتی کا دار و مدار ہوتا ہے۔

جب تک تم جوانوں اور افسروں سے اس مقصد کے تحت شفقت آمیز برتاؤ نہیں کروگے کہ وہ حکومت کو ایک بھاری بوجھ نہ سمجھیں یا اس کے سقوط میں مُمِدّ نہ ہوں اُس وقت تک فوجیوں کو تمھارے نصیحتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اُن کی ضروریات پوری کرتے رہو اور انھوں نے جو خدمات انجام دی ہوں ان کی بار بار تعریف کرو۔ انشاء اللہ اس روش کے نتیجے میں بہادر آدمی زیادہ بہادری کا مظاہرہ کریں گے اور بُزدل اشخاص بھی دلیرانہ افعال انجام دیں گے۔

دوسروں کے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ایک کی غلطی کا الزام دوسرے کے سر پر نہ تھوپو اور مناسب صلہ دینے میں بخل سے کام نہ لو۔ اِس بات کا خیال رکھو کہ کسی ایسے شخص پر نوازشات نہ کرو جس نے کوئی کارِ نمایاں انجام نہ دیا ہو اور محض اپنی خاندانی حیثیت پر بھروسہ کرتا ہو اور اس شخص کا جائز صلہ جس نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہوں محض اِس بنا پر نہ روک رکھو کہ وہ زندگی میں معمولی حیثیت کا مالک ہے۔

حقیقی ہدایت

جب کبھی تم اپنے اعمال کے بارے میں تذبذب کا شکار ہو جاؤ تو ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو راہِ راست کی جانب رہنمائی کرنا چاہتا ہے اُن کے لیے اُس کا فرمان ہے کہ: "اے ایمان والو! اللہ کی اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں صاحب الامر ہوں اور جب تم میں اختلافِ رائے ہو تو اللہ اور اس کے رسولؐ کی جانب رجوع کرو۔" اللہ کی جانب رجوع کرنے کے معنی اللہ کی کتاب سے ہدایت حاصل کرنے

کے ہیں اور رسولؐ سے رجوع کرنے سے مراد مسلّمہ احادیث کی پیروی کرنا ہے۔

قاضی القضاۃ

اپنے قاضی القضاۃ کے طور پر لوگوں میں سے ایسے شخص کا انتخاب کرو جو اِن میں سے بہترین ہو۔ ایک ایسا شخص جس پر گھریلو پریشانیاں مسلّط نہ ہوں۔ جو مرعوب نہ ہو سکتا ہو۔ جو اکثر غلطی نہ کھاتا ہو۔ جسے راہِ راست کا علم ہو جائے تو پھر اس سے رُوگردانی نہ کرتا ہو۔ جو اپنی ذات میں مستغرق نہ ہو اور حریص بھی نہ ہو۔ جو پورے حالات سے واقف ہونے سے پہلے فیصلہ نہ کرے۔ جو ہر موجود شک کو بڑی احتیاط سے جانچے اور سب حقائق کو مدِّنظر رکھتے ہوئے واضح فیصلہ دے۔ جو وکلاء کے دلائل سے بھڑک نہ اُٹھے اور جو بھی نئے حقائق سامنے آئیں ان کا تحمّل سے جائزہ لے اور فیصلہ دینے میں قطعاً غیر جانبدار رہو۔ جسے خوشامد گمراہ نہ کر سکے اور جو اپنے عہدے پر اتراتا نہ ہو لیکن ایسا آدمی دستیاب ہونا آسان کام نہیں ہے۔

جب تم اِس عہدے کے لیے مناسب آدمی کا انتخاب کر لو تو اُسے معقول تنخواہ دو تاکہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق آرام سے زندگی گزار سکے اور تحریص کا شکار نہ ہو۔ اپنے دربار میں اُسے اتنا اعلیٰ مقام دو کہ کوئی اس کی خواہش کرنے کا خواب بھی نہ دیکھ سکے اور چغلی اور سازش اسے چھُو بھی نہ سکے۔

ماتحت عدلیہ

یاد رکھّو! اس کے (یعنی قاضی القضاۃ کے) انتخاب میں انتہائی احتیاط

برتنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ ایسا عہدہ ہے جسے خودغرض طالع آزما لوگ اس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ اپنی مقصد برآری کرسکیں۔ اپنے قاضی القضاۃ کا انتخاب کرلینے کے بعد دوسرے افسروں کے چناؤ کی جانب بھرپور توجّہ دو۔ ان کا تربیتی دَور تسلّی بخش طور پر مکمّل ہوجانے کے بعد انھیں ان کی اسامیوں پر مستقل کردو۔ ذمّے داری کی حامل اسامیوں کے لیے ذاتی تعلّقات یا کسی اثر کے تحت امّیدواروں کا انتخاب ہرگز نہ کرو کیونکہ اس کا نتیجہ ناانصافی اور بددیانتی کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

اعلیٰ اسامیوں کے لیے تجربے کار اور پختہ ایمان رکھنے والے اور اچھّے خاندانوں سے تعلّق رکھنے والے اشخاص کا انتخاب کرو۔ ایسے لوگ آسانی سے ہوس کا شکار نہیں ہوں گے اور اپنی ذمّے داریاں دوسروں کے مستقل مفاد کو مدّنظر رکھتے ہوئے انجام دیں گے۔ اُن کی تنخواہیں بڑھادو اور انھیں پُرسکون زندگی مہیّا کرو۔ باطمینان زندگی ذاتی تطہیر میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ وہ یہ خواہش محسوس نہیں کریں گے کہ اپنی حیثیت قائم رکھنے کے لیے اپنے ماتحتوں کی کمائی میں سے حصّہ بٹائیں۔ پھر اُن کے پاس تمھارے احکام کی تعمیل نہ کرنے یا سرکاری رقوم خورد بُرد کرنے کے لیے کوئی عذر بھی نہیں ہوگا۔ انھیں پتا چلے بغیر اُن پر نظر رکھّو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے اندر حقیقی راستبازی اور خدمتِ خلق کا صحیح جذبہ پیدا کرلیں لیکن جب بھی اُن میں سے کسی پر بددیانتی کا الزام لگے اور تمھاری خفیہ سروس کے ذریعے جرم کی تصدیق ہوجائے تو اِس امر کو اُسے سزا دینے کے لیے کافی تصوّر کرو۔ سزا جسمانی ہوسکتی ہے اور کسی مقرّرہ مقامِ مذلّت پر عوام کے سامنے دی جاسکتی ہے۔

محکمۂ مال

جو لوگ حکومت کو مالیہ ادا کرتے ہیں اُن کی خوشحالی کو یقینی بنانے کے لیے محکمۂ مال کے بارے میں بہت احتیاط برتنی چاہیے کیونکہ دوسروں اور بالخصوص عوام کی خوشحالی کا انحصار اُنہی کی خوشحالی پر ہے۔ بلاشبہ مملکت مالیے کے بَل بوتے پر قائم رہتی ہے۔ تمھیں مزروعہ زمین کی مناسب نگہداشت کو مالیہ وصول کرنے سے زیادہ اہم سمجھنا چاہیے کیونکہ زمین کو پیداوار کے قابل بنائے بغیر مالیہ وصول نہیں کیا جاسکتا۔ جو شخص زمین کی حالت سدھارنے کے لیے کاشتکار کی مدد کیے بغیر اس سے مالیہ طلب کرتا ہے وہ کاشتکار کو ناروا زحمت میں مبتلا کرتا ہے اور مملکت کو تباہ کرتا ہے۔ ایسے شخص کی حکومت دیرپا نہیں ہوسکتی۔ اگر کاشتکار وباؤں، خشک سالی، بہت زیادہ بارشوں یا زمین کے بنجر ہونے یا سیلاب سے فصلوں کو نقصان پہنچنے کی بنا پر مالیے میں تخفیف کی درخواست کریں تو اُن کے مالیے میں مناسب تخفیف کردو تاکہ اُن کی حالت سُدھر جائے اس وجہ سے مالیے میں کمی کی پروا مت کرو کیونکہ جب زمینوں کی حالت بہتر ہو جائے گی تو تمھیں کئی گُنا زیادہ مالیہ وصول ہو جائے گا اور تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ اپنے شہروں کی حالت درست کرو اور مملکت کا وقار بڑھا سکو (جب تم نامساعد حالات میں مالیے میں تخفیف کرو گے تو) سب لوگ تمھاری تعریف کریں گے اور تمھاری انصاف پسندی کے معترف ہو جائیں گے۔ نتیجتاً جو اعتماد تمھارے متعلّق ان کے دلوں میں پیدا ہوگا وہ تمھاری قوّت ثابت ہوگا کیونکہ وہ لوگ تمھارا بوجھ بٹانے پر تیّار ہوں گے۔

تم جتنے لوگوں کو تمھارا جی چاہے زمین پر آباد کردو لیکن اگر زمین کو

ترقّی نہ دی گئی تو وہ لوگ بے چین ہوجائیں گے۔ کاشتکاروں کی بربادی کا باعث وہ حاکم ہوتے ہیں جو اس خوف کے مارے کہ اُن کی حکومت زیادہ دیر نہ چل سکے گی جس قدر جلد ہوسکے ہر ممکن طریقے سے دولت سمیٹنا چاہتے ہیں۔ اسی قماش کے لوگ ہوتے ہیں جو مثالوں اور سابقہ واقعات سے کوئی سبق نہیں سیکھتے۔

دفتری عملہ

اپنے عملے اور محرّروں پر نظر رکھّو اور جو اُن میں سے بہترین ہوں اُن کا انتخاب اپنی خفیہ خط وکتابت کے لیے کرو۔ یہ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو اعلیٰ کردار کے مالک ہوں اور تمھارے مکمّل اعتماد کے مستحق ہوں۔ اپنی خصوصی حیثیت کو تمھاری مخالفت کے لیے استعمال نہ کریں۔ اپنی ذمّے داریوں کی انجام دہی میں کوتاہی نہ برتیں۔ معاہدوں کے مسوّدے تیّار کرنے میں بیرونی ترغیب سے مغلوب ہوکر تمھارے مفادات کو نقصان نہ پہنچائیں یا تمھیں مناسب مدد دینے اور پریشانی سے بچانے سے قاصر نہ رہیں اور اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے اپنی سنگین ذمّے داریوں کا خیال رکھّیں کیونکہ جو شخص اپنی ذمّے داریوں کا احساس نہ کرے وہ دوسروں کی ذمّے داریوں کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔ ایسے کام کے لیے لوگوں کا انتخاب ان کے بارے میں قائم کردہ اوّلین رائے یا محبّت یا صدقِ نیّت کی بنا پر نہ کرو کیونکہ امرِ واقع یہ ہے کہ کئی ایک دیانتداری اور اچھّی تربیت سے عاری لوگوں کے نمائشی دعوے بعض اوقات حکّام کی سمجھ بُوجھ کو بھی جُل دے جاتے ہیں۔ انتخاب ایک ایسے تربیتی دَور کے بعد کرنا چاہیئے جس کے دوران متعلّقہ شخص کی دیانت داری کو پرکھ لیا جائے۔ اسامیاں براہِ راست پُر کرتے وقت اِس بات کا خیال رکھّو کہ جن لوگوں کا انتخاب کرو وہ لوگوں میں اثر و رسوخ رکھتے ہوں

اور دیانت داری کے لحاظ سے ان کی شہرت اچھی ہو کیونکہ اس قسم کا انتخاب اللہ کے نزدیک بھی اور حاکم کے لیے بھی پسندیدہ ہوتا ہے۔ انتظامیہ کے ہر محکمے کا ایک ایسا سربراہ ہونا چاہیئے جسے کسی کام سے پریشانی نہ ہو اور کام کا بوجھ خواہ کتنا ہی کیوں نہ ہو اُسے ناگوار نہ گزرے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ تم اپنے عملے اور محرّروں کی جس کمزوری سے بھی چشم پوشی کروگے وہ تمھارے نامۂ اعمال میں لکھی جائے گی۔

تجارت اور صنعت

تاجر اور صنعت کار تمھارے سامنے جو مفید منصوبے پیش کریں انھیں منظور کرلو اور حکیمانہ مشوروں سے اُن کی مدد کرو۔ ان لوگوں میں سے کچھ تو شہروں میں رہتے ہیں اور کچھ اپنی مصنوعات اور اوزار لیے کر جگہ بہ جگہ پھرتے ہیں اور ہاتھ کی محنت سے روزی کماتے ہیں۔ تجارت اور صنعت مملکت کی آمدنی کا ذریعہ ہیں جب کہ عامّۃ النّاس اس قسم کی مشقّت کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ ان پیشوں میں مشغول لوگ تکلیف اُٹھا کر دُور اور نزدیک سے، خشکی اور سمندر کے راستے اور پہاڑوں اور جنگلوں سے گزر کر سامان اکٹّھا کرتے ہیں اور قدرتی طور پر منافع کماتے ہیں۔

یہ ایک ایسا امن پسند طبقہ ہوتا ہے جس سے کسی فتنہ وفساد کا خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ امن وسکون چاہتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ فساد برپا کرنے کے اہل ہی نہیں ہوتے۔ مملکت کے ہر حصّے کا دورہ کرو اور اس طبقے سے ذاتی رابطہ قائم کرو اور ان کے حالات کے بارے میں اُن سے دریافت کرو لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ ان میں سے اکثر بے حد حریص ہوتے ہیں اور معاملات میں بددیانتی

برتتے ہیں۔ وہ غلّے کی ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں اور اسے مہنگے داموں بیچنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی چیز عوام کے لیے بے حد نقصان دہ ہوتی ہے۔ اس بُرائی کو دُور نہ کرنا حاکم کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو ذخیرہ اندوزی سے باز رکھّو کیونکہ رسولِ اکرمؐ نے اسے ناجائز قرار دیا تھا تاکہ تجارت آسانی سے ہوتی رہے۔ ناپ تول ٹھیک ہو اور قیمتیں اِس طرح معیّن کی جائیں کہ بیچنے والے اور خریدار میں سے کوئی گھاٹے میں نہ رہے اور اگر تمھاری جانب سے تنبیہ کے باوجود کوئی شخص تمھاری حکم عدولی کرے اور ذخیرہ اندوزی کے جرم کا مرتکب ہو تو اُسے کڑی سزا دو۔

فقرا

خبردار! ان فقرا کے مسئلے سے نمٹتے وقت اللّٰہ کا خوف کرو جن کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں اور جو بیکس، نادار اور بے سہارا، مغموم اور فلاکت زدہ ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی قسمت پر شاکر رہتے ہیں اور اپنی پریشان حالی کے باوجود کسی سے خیرات طلب نہیں کرتے فی سبیل اللّٰہ ان کی مدد کرو کیونکہ ان کے مفادات کی حفاظت کی ذمّے داری تم پر عائد ہوتی ہے اور وہ لوگ کہیں بھی ہوں، خواہ وہ تم سے قریب ہوں یا دور بیت المال کی دولت کا کچھ حصّہ اُن کی بہتری کے لیے مخصوص کر دو۔ دونوں قسم کے لوگوں کے حقوق تمھاری نظر میں یکساں ہونے چاہئیں۔ خواہ تمھاری مصروفیات کچھ بھی ہوں ان لوگوں کو اپنے دل سے نہ بھلاؤ کیونکہ ان کے حقوق سے پہلوتہی برتنے کے بارے میں اللّٰہ تعالیٰ کے حضور میں کوئی عذر قابلِ قبول نہ ہوگا۔ ان کے مفادات کو اپنے مفادات کے مقابلے میں غیر اہم نہ سمجھو اور انھیں

قابلِ لحاظ امور کے دائرے سے خارج نہ کرو اور جو لوگ انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھیں اور تمھیں اُن کے حالات سے بے خبر رکھیں اُن سے ناپسندیدگی کا اظہار کرو۔

اپنے افسران میں سے ایسے لوگوں کا انتخاب کرو جو دیانت دار اور خدا ترس ہوں اور تمھیں فقراء کے حالات سے پوری طرح باخبر رکھ سکیں۔ ان غریب لوگوں کے لیے ایسا اہتمام کرو کہ تمھیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور میں ان کے بارے میں کوئی عذر پیش کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے کیونکہ لوگوں کا یہی طبقہ ہے جو سب سے زیادہ کریمانہ سلوک کا مستحق ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے حقوق ادا کر کے اس کی جزا اللہ تعالیٰ سے طلب کرو اور ان میں سے ایسے معمّر لوگوں کی ضروریات پوری کرنا اپنا مقدّس فریضہ سمجھو جن کا کوئی مستقل ذریعۂ معاش نہ ہو اور جو خیرات مانگنے پر بھی آمادہ نہ ہوں۔ یہی وہ فریضہ ہے جس کی ادائیگی حکّام کو سخت گراں گزرتی ہے لیکن جن معاشروں کو بصیرت سے نوازا گیا ہے وہ اس فریضے کو خوش دلی سے ادا کرتے ہیں۔ فقط ایسی ہی قومیں یا معاشرے ہیں جو فقراء کے حقوق کی ادائیگی کے متعلق اللہ تعالیٰ سے کیے گئے پیمان کو سلامتِ طبع سے پورا کرتے ہیں۔

کھُلی مجالسِ مشاورت

مظلوموں اور مسکینوں سے وقتاً فوقتاً کھُلی مجالسِ مشاورت میں ملاقات کرو اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھتے ہوئے اُن سے بے تکلّفانہ گفتگو کرو۔ اس موقع پر اپنے مسلّح محافظوں، سِول افسروں اور پولیس اور

جاسوسی کے محکموں کے افراد کو اپنے پاس سے ہٹادو تاکہ غریب لوگوں کے نمائندے بلاخوف وخطر اور کھل کر اپنی شکایات تمھارے سامنے پیش کرسکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے رسولِ اکرمؐ کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ کوئی ایسی قوم یا معاشرہ بلند مقام حاصل نہیں کرسکتا جس میں طاقتور لوگ کمزوروں کے حقوق ادا نہ کریں۔ اگر وہ لوگ سخت زبان استعمال کریں تو اسے تحمل سے برداشت کرو اور اگر وہ اپنا معاملہ واضح طور پر پیش نہ کرسکیں تو بُرا مت مانو اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے انعام واکرام کے دروازے تمھارے لیے کھول دے گا۔ تم انھیں جو کچھ دے سکو خوش دلی سے دو اور جو نہ دے سکو اس کے بارے میں پورے خلوص سے وضاحت کردو۔

بعض چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے بارے میں فوری اقدام ضروری ہوتا ہے۔ محرّروں کی شکایات کے ازالے کے لیے اپنے افسروں کی سفارشات قبول کرو۔ اس بات کا خیال رکھو کہ جو درخواستیں اور عرضداشتیں تمھارے غور کے لیے دی گئی ہوں وہ اسی دن تمھارے سامنے پیش کردی جائیں خواہ تمھارے افسر انھیں بیچ میں ہی روک لینے کی کتنی بھی کوشش کریں۔ ایک دن کا جو کام ہو اُسے اُسی دن نمٹادو کیونکہ آنے والا دن اپنے ساتھ اور کام لے کر آئے گا۔

اللہ تعالیٰ سے راز ونیاز

اور پھر اپنے وقت کا بہترین حصہ اللہ تعالیٰ سے راز ونیاز کے لیے مختص کرنا بھی نہ بھولو اگرچہ تمھارے وقت کا ہر لمحہ جو مخلصانہ طور پر لوگوں کی خدمت کے لیے صرف ہو اللہ تعالیٰ کا ہی ہوتا ہے۔ وہ مخصوص وقت

جو تم عبادت میں گزارنا چاہتے ہو اُسے محدود شرعی معنی میں مقرّر کردہ نمازِ پنجگانہ کی ادائیگی پر صرف کرنا چاہیئے۔ دن میں بھی اور رات کو بھی اپنے آپ کو نماز میں مشغول رکھو اور جہاں تک ہو سکے مکمّل راز و نیاز حاصل کرنے کی خاطر یہ کوشش کرو کہ تمھاری نمازیں اُکتاہٹ پیدا نہ کریں۔

اور جب تم باجماعت نماز کی امامت کرو تو تمھاری نماز اتنی طویل نہیں ہونی چاہیئے کہ لوگوں کے لیے زحمت کا باعث ہو یا ان کے دل میں نفرت پیدا کر کے اپنا اثر کھو دے کیونکہ جماعت میں بیمار بھی شامل ہوتے ہیں اور وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنھیں کچھ ضروری کام سرانجام دینا ہوتے ہیں۔

جب مجھے یمن جانے کا حکم ملا تو میں نے رسول اللہؐ سے دریافت کیا تھا کہ مجھے نماز کے بارے میں وہاں کے لوگوں کے ساتھ کیا انداز اختیار کرنا چاہیئے۔ آپ نے جواب میں فرمایا تھا۔ " نماز یوں ادا کرو جیسے تم میں سے ایک ضعیف ترین شخص ادا کرتا ہے اور اہلِ ایمان کے لیے التفات کی مثال قائم کرو۔

کنارہ کشی مناسب نہیں

جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر عمل پیرا ہونے کے علاوہ ایک اور چیز ذہن میں رکھو۔ اپنے آپ کو کچھ عرصے کے لیے بھی لوگوں سے الگ تھلگ نہ رکھو کیونکہ ایسا کرنے سے انسان اُن کے حالات سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ یہ عمل حاکم میں ایک غلط زاویۂ نگاہ قائم کر دیتا ہے اور وہ اہم اور غیر اہم، صحیح اور غلط اور سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ حاکم

بھی آخر انسان ہی ہوتا ہے اور جو چیز اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو اس کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا۔

سچّائی کے ساتھ کوئی ایسا امتیازی نشان منسلک نہیں ہوتا جو انسان کو سچّائی اور جھوٹ کی مختلف اقسام میں فرق کرنے کے قابل بنا سکے حقیقت یہ ہے کہ تم دو میں سے ایک چیز ہو سکتے ہو، یا تو تم انصاف پسند ہو سکتے ہو اور یا بے انصاف۔ اگر تم انصاف پسند ہو تو تم لوگوں سے دُور نہیں رہو گے بلکہ ان کی بات سنو گے اور ان کی حاجتیں پوری کرو گے۔ اس کے برعکس اگر تم بے انصاف ہو گے تو خود لوگ تم سے دُور رہیں گے۔ تمھارے الگ تھلگ رہنے میں کیا خوبی ہے؟ بہر حال کنارہ کشی کوئی پسندیدہ چیز نہیں اور بالخصوص اُس وقت جب کہ تم پر یہ ذمّے داری عائد ہوتی ہے کہ تم لوگوں کی ضروریات کا خیال رکھو۔ تمھارے افسروں کے خلاف سختی کی شکایتوں یا انصاف کے لیے عرضداشتوں سے تمھیں کبیدہ خاطر نہیں ہونا چاہیے۔

یہ بات واضح طور پر سمجھ لو کہ جو لوگ سب سے زیادہ تمھارے مقرّب ہوں گے وہ اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسروں کا مال ہتیانا چاہیں گے اور ناانصافی پر مبنی افعال کے مرتکب ہوں گے، اُن کے اس رجحان کو دبا دو۔ اپنا یہ اصول بنا لو کہ زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی اپنے کسی عزیز کو نہ دو گے۔ یوں وہ دوسروں کے مفادات کو نقصان پہنچانے سے بھی باز رہیں گے اور تم بھی اللہ تعالیٰ کی اور لوگوں کی ناراضگی سے بچ جاؤ گے۔

اس بات کی پروا کیے بغیر کہ فریقین میں سے کوئی تمھارا رشتے دار ہے یا نہیں، پورا پورا انصاف کرو۔ اگر تمھارے رشتے داروں یا ساتھیوں میں سے کوئی قانون کی خلاف ورزی کرے تو خواہ ایسا کرنا تمھارے لیے ذاتی طور

پر دُکھ کا موجب ہی کیوں نہ ہو اُسے قانون کے مطابق سزا دو کیونکہ یہ مملکت کے لیے بے حد مفید ہوگا۔ اگر کسی وقت لوگوں کو شک گزرے کہ تم نے کسی معاملے میں اُن کے ساتھ انصاف نہیں کیا تو اپنے دل کی بات انھیں بتا دو اور ان کا شک رفع کر دو۔ اس طرح تمھاری طبیعت انصاف سے ہم آہنگ ہو جائے گی اور لوگ تم سے محبّت کرنے لگیں گے، اس طرح تمھاری، اُن لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔

صلح اور معاہدات

اس بات کا خیال رکھّو کہ اگر دشمن خود صلح کی پیشکش کرے تو تمھیں اُسے رَد نہیں کرنا چاہیے۔ اس پیشکش کو قبول کر لو کیونکہ ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہوگا۔ صلح فوج کے لیے آسائش کا موجب ہوتی ہے یہ تمھاری پریشانیوں میں کمی کرتی ہے اور مملکت میں امن وامان کو فروغ دیتی ہے لیکن یاد رکھّو! جب صلحنامے پر دستخط کیے جائیں تو محتاط رہو کیونکہ بعض دشمن صلح کی شرائط محض اس مقصد سے پیش کرتے ہیں کہ تم اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگو اور جب تم غیر محتاط ہو جاؤ تو وہ تم پر دوبارہ حملہ کر دیں لہٰذا تمھیں چاہیے کہ پوری پوری احتیاط برتو اور ان کے اظہارِ صلح پر غیر ضروری اعتماد نہ کرو۔ تاہم اگر معاہدۂ صلح کے مطابق تم نے کچھ شرائط قبول کر لی ہوں تو ان شرائط پر پورا پورا عمل کرو۔ یہ ایک قسم کی امانت ہے جس کی پاسداری کرنی چاہیے اور جب کبھی تم کسی چیز کا وعدہ کرو تو اُسے پوری قوّت کے ساتھ نبھاؤ کیونکہ دوسرے معاملات کے بارے میں خواہ کتنا ہی اختلافِ نظر کیوں نہ ہو وعدہ نبھانے جتنی عمدہ بات اور کوئی نہیں۔

غیر مسلم بھی اس چیز کو ملحوظ رکھتے ہیں کیونکہ وہ عہد و پیمان توڑنے کے خطرناک نتائج سے واقف ہیں۔ اپنی ذمّے داریاں پوری کرنے میں کبھی بھی ٹال مٹول سے کام نہ لو اور نہ ہی وعدہ شکنی کرو اور نہ ہی دشمن کو دھوکا دو کیونکہ وعدہ شکنی اللہ تعالیٰ کے خلاف ایک فعل ہے اور ایک مسلّمہ بدکار شخص کے علاوہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے خلاف کوئی فعل نہیں کرتا۔

بلاشبہ ربّانی وعدے ایک رحمت ہیں جو تمام بنی نوع انسان پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ایک ایسی پناہ گاہ ہے جس کی دنیا کے طاقتور سے طاقتور اشخاص بھی تمنّا رکھتے ہیں کیونکہ اس سلسلے میں دھوکا کھانے کا کوئی خوف نہیں ہوتا لہٰذا کوئی ایسا وعدہ نہ کرو جس سے بچ نکلنے کے لیے بعد میں تمھیں بہانے تلاش کرنے پڑیں اور نہ ہی اس بات سے پھرو جس پر قائم رہنے کا تم نے دوسرے کو یقین دلایا ہو اور نہ ہی اپنے اس وعدے کو توڑو خواہ اس پر قائم رہنا شروع میں تمھارے لیے کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو کیونکہ اس پر قائم رہ کر صبر سے مثبت نتائج کا انتظار کرنا کسی خوف کی بنا پر اسے توڑ دینے سے زیادہ بہتر ہے۔

خبردار! کسی جائز وجہ کے بغیر کشت و خون سے اجتناب کرو۔ انسان کو تباہی اور بربادی سے دوچار کرنے کے لیے اس سے زیادہ نقصان دہ چیز اور کوئی نہیں۔ جو خون عمداً گرایا جائے وہ مملکت کی زندگی کو مختصر کر دیتا ہے۔ یہی وہ جرم ہے جس کے لیے قیامت کے دن انسان کو سب سے پہلے جواب دہی کرنی ہوگی لہٰذا یاد رکھو! اپنی مملکت کی بنیادیں خون پر استوار کرنے کی خواہش مت کرو کیونکہ یہی وہ خون ہے جو بالآخر مملکت کو کمزور کر کے اسے دوسروں کے ہاتھوں میں منتقل کر دیتا ہے۔ میرے اور اللہ کے حضور

میں جان بوجھ کر کشت وخون کرنے کے لیے کوئی عذر قابلِ قبول نہیں۔
قتل ایک ایسا جرم ہے جس کی سزا موت ہے۔ اگر کسی وجہ سے کسی کم تر جرم کے لیے حکومت کی جانب سے دی جانے والی جسمانی سزا کے نتیجے میں مجرم کی موت واقع ہو جائے تو فوت شدہ شخص کے اقربا کے قصاص طلب کرنے میں حکومت کا وقار آڑے نہیں آنا چاہیے۔

آخری ہدایات

کسی کام کو اس کا وقت آنے سے پہلے انجام دینے میں جلدی نہ کرو اور نہ ہی اُس کا مناسب وقت آنے پر اُسے ملتوی کرو۔ ایک غلط کام کرنے پر اصرار نہ کرو اور نہ ہی ایک غلطی کا ازالہ کرنے میں کوتاہی برتو۔ ہر کام اس کے صحیح وقت پر کرو اور ہر چیز کو اس کے مناسب مقام پر رکھّو۔ جب سب لوگ کسی بات پر متّفق ہوں تو اپنی رائے اُن پر مسلّط نہ کرو اور نتیجۃً جو ذمّے داری تم پر عائد ہوتی ہو اُس سے عہدہ برآ ہونے میں غفلت نہ کرو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی نظریں تم پر لگی رہیں گی اور جو کچھ تم ان کے لیے کرو گے اس کے لیے جوابدہ ہو گے۔ اگر تم اپنے فرائض کی ادائیگی میں رتی بھر کوتاہی کرو گے تو تمھیں مکافاتِ عمل کا سامنا کرنا ہوگا۔ غصّہ ضبط کرو اور اپنے ہاتھوں اور زبان کو قابو میں رکھّو۔ جب کبھی تمھیں غصّہ آئے تو ضبطِ نفس سے کام لو ورنہ تم اپنی پریشانیوں میں اضافہ کر لو گے۔
یہ ضروری ہے کہ تم سے پہلے جو اچھّے اور انصاف پسند حکمراں گزرے ہیں انھوں نے جن اصولوں سے فیضان حاصل کیا ہے تم ان کا بغور مطالعہ کرو۔ ہمارے رسولِ اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ، احادیث اور کتاب اللہ سے

اور معاملات کو نمٹانے کے لیے خود میرے طریقۂ کار سے تم نے جو اثر قبول کیا ہو اس پر خوب غور کرو۔ جو ہدایات میں نے (اس خط میں) دی ہیں اور جن کی پیروی کرنے کا تم نے باضابطہ طور پر وعدہ کیا ہے اُن پر حتی الامکان عمل پیرا ہونے کی پوری پوری کوشش کرو۔ اس فرمان کے ذریعے میں تمھیں تاکید کرتا ہوں کہ اپنی دلی مرضی کے آگے سپر انداز نہ ہوا ور تم پر جو ذمّے داریاں عائد کی گئی ہیں اُن سے روگردانی نہ کرو۔

میں اللہ تعالیٰ اور اس کی نوازشات کی لامحدود فضا میں پناہ طلب کرتا ہوں اور تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ میرے ساتھ مل کر دعا کرو کہ وہ ہم دونوں کو اس کی مرضی کے سامنے اپنی مرضی سے رضاکارانہ طور پر دستبردار ہو جانے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں ہمّت بخشے کہ ہم اُس کے اور اُس کی مخلوق کے سامنے اپنی ذمّے داریوں سے بطورِ احسن عہدہ برآ ہوں تاکہ بنی نوعِ انسان ہمیں یاد رکھّیں اور ہم جو کچھ کریں وہ باقی رہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے اس کی نعمتوں کے عروج پر پہنچنے کی خواہش کرتا ہوں اور دُعا مانگتا ہوں کہ وہ تمھیں اور مجھے اپنی رحمت سے نوازے اور اس کے راستے میں شہادت کا رتبہ پانا نصیب کرے۔ بلاشبہ ہمیں اس کی جانب لَوٹ کر جانا ہے۔ رسولِ اکرمؐ اور ان کی آلِ اطہار پر اس کی رحمتیں نازل ہوں۔

باب ہفتم

ارکانِ نظامِ اسلام

ارکانِ نظامِ اِسلام

پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم عام الفیل میں ربیع الاوّل کے مہینے میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ یہی وہ سال تھا جس میں سلطنتِ حبشہ کی جانب سے یمن میں متعین نائب السلطنت ابرہہ اشرم ایک بہت بڑی فوج لے کر جس میں ایک ہاتھی بھی تھا شہرِ مکہ پر حملہ آور ہوا۔ اس حملے سے اس کا مقصد خانۂ کعبہ کو تباہ و برباد کرنا تھا۔

رسولِ اکرمؐ کے والد ماجد حضرت عبداللہ آپ کی ولادت سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ کا نام آمنہ بنتِ وہب تھا۔ آپ کی پیدائش کے موقع پر بہت سی ایسی نشانیاں ظہور پذیر ہوئیں جن سے اہلِ عالم اندازہ لگا سکتے تھے کہ دنیا کے نجات دہندہ کا ورودِ مسعود ہو گیا ہے۔

بنی ہاشم کے نو مولود چشم و چراغ کو چند دن آپ کے چچا ابولہب کی آزاد کردہ کنیز ثویبہ نے دودھ پلایا۔ اس کے بعد اشرافِ عرب کے دستور کے مطابق آپ کو ایک دیہاتی دائی حلیمہ بنت ابی ذؤیب عبداللہ

کے سپرد کر دیا گیا جن کا تعلق قبیلہ بنو سعد سے تھا۔

جب آپ کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو دائی حلیمہ نے آپ کو واپس لاکر آپ کی والدہ کے سپرد کر دیا لیکن ایک سال بعد وہ انتقال کر گئیں۔ اب اپنے یتیم الطرفین پوتے کی پرورش اور نگہداشت کی ذمّے داری آپ کے دادا حضرت عبدالمطّلب کے کندھوں پر آپڑی۔

رسولِ اکرمؐ کی ذاتِ بابرکات سے بچپن ہی سے ایسے آثار نمایاں تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ قدرت آپ کو کسی کارِ عظیم کے لیے تیّار کر رہی ہے۔ آپ نے کبھی بھی قریش کی بُت پرستانہ رسوم میں حصّہ نہیں لیا اور نہ ہی کبھی جھوٹ بولا۔ آپ کی عادات پسندیدہ اور کردار بے داغ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جسے بھی آپ سے سابقہ پڑا وہ آپ کی ذاتِ اقدس کا گرویدہ ہو گیا۔ جلد ہی لوگ آپ کو 'صادق' اور 'امین' کے القاب سے پکارنے لگے۔

جب آپ کی عمر تقریباً آٹھ سال کی ہوئی تو آپ کے دادا بھی انتقال فرما گئے۔ مرنے سے پہلے انھوں نے اپنے پیارے پوتے کو اپنے بیٹے حضرت ابوطالب کے سپرد کر دیا۔ حضرت ابوطالب نے اپنی ذمّے داریاں مرتے دم تک بطورِ احسن انجام دیں۔ آپ اپنے بھتیجے کو اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ چاہتے تھے۔

ابتدائی زندگی

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سنِ بلوغت کو پہنچ گئے تو آپ نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ دوسروں پر بوجھ بنے رہیں، چنانچہ آپ نے

اپنی روزی کمانے کے لیے پوری پوری کوشش کی۔ کچھ دن آپ نے چراگاہ میں بھیڑیں بھی چرائیں۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی کہ آپ بنفسِ نفیس محنت کی عظمت کی مثال قائم کریں۔

اُن دنوں مکّہ میں ایک عالی مرتبت اور ثروت مند خاتون رہتی تھیں جن کا نام خدیجہؓ بنت خویلد تھا۔ وہ تجارت کرتی تھیں اور کسی نہ کسی کو مالِ تجارت دے کر خرید و فروخت کے لیے دوسرے ممالک میں بھیجتی تھیں۔ جب انھوں نے حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے فہم و فراست اور راستبازی کی تعریف سُنی تو کمیشن کی بنیاد پر اپنے کاروبار کے لیے آپ کا انتخاب کرلیا۔ چنانچہ آپ نے پچّیس سال کی عمر میں جنابِ خدیجہؓ کا سامان لے کر ملک شام کا سفر کیا اور اس کی خرید و فروخت کے سلسلے میں اپنی ذمّے داریاں بطورِ احسن انجام دیں۔ اس سفر میں جنابِ خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ واپسی پر اُس نے آپ کی عادات اور بلندیٔ کردار کی بے حد تعریف کی اور جناب خدیجہؓ اس قدر متاثّر ہوئیں کہ انھوں نے آپ سے شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ نکاح کی رسوم جلد ہی سر انجام پاگئیں اور یہ شادی بڑی کامیاب ثابت ہوئی حضرت خدیجہؓ خوبرُو اور مدبّر ہونے کے علاوہ بڑی رحمدل اور عالی کردار کی مالکہ تھیں۔ سب سے پہلے وہی آنحضرتؐ کی رسالت پر ایمان لائیں۔ انھوں نے اپنی دولت بلا تامّل اسلام کی خاطر خرچ کردی۔ آنحضرتؐ ان کے پیار اور خلوص کو ہمیشہ بڑے محبّت آمیز طریقے سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ آپ کی ایک اور بیوی جنابِ عائشہ کہتی ہیں کہ اُنھیں حضرت خدیجہؓ کے علاوہ آنحضرتؐ کی کسی بیوی سے حسد نہیں ہوا حالانکہ انھوں نے حضرت خدیجہؓ کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ جب کبھی رسولِ اکرمؐ گوسفند ذبح کرتے تھے تو گوشت کا ایک ایک ٹکڑا

حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کو ضرور بھجواتے تھے۔

شادی کے بعد آنحضرتؐ حضرت خدیجہؓ کے ہاں منتقل ہو گئے۔ اب آپ کی زندگی مستحکم بنیادوں پر استوار ہو گئی۔ زن و شوہر کے مابین مکمّل موافقت اور ذہنی ہم آہنگی تھی۔ حضرت خدیجہؓ آپ کی خدمت کرنے اور آپ کی پریشانیاں دُور کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتی تھیں۔

یہی وہ دُور تھا جب آنحضرتؐ کی نبوّت کے آثار آہستہ آہستہ ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔ آپ اکثر و بیشتر بُت پرستی کے تیرہ و تار ماحول اور لہو و لعب کی وحشیانہ خرمستیوں سے دُور کئی دنوں تک اور بعض اوقات ایک ایک مہینہ غارِ حرا میں گزارتے۔ یہاں آپ عمیق غور و فکر اور خالقِ کائنات کی پرستش میں مشغول رہتے۔

اسی دوران میں آپ کو فرشتوں کی شکلیں دکھائی دینے لگیں اور یوں محسوس ہونے لگا کہ آپ کے اردگرد موجود بے جان چیزوں میں سے آوازیں نکل رہی ہیں۔

جب آپ کا سنِ مبارک چالیس برس کا ہوا تو ایک رات جبکہ آپ غارِ حرا ہی میں تشریف فرما تھے جبرئیل علیہ السّلام پہلی وحی لے کر آسمان سے نازل ہوئے:

"اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ؕ"

(سورۃ العلق ۹۶ : ۱-۴)

چنانچہ دینِ حق کی شمع تھامے آپ بہ عجلت گھر تشریف لے گئے۔

بلاشبہ اس پُرشکوہ واقعہ کی عظمت نے آپ کے دل و دماغ پر بڑا گہرا نفسیاتی اثر چھوڑا ہوگا۔

گھر پہنچ کر آپ آرام کی غرض سے بستر میں لیٹ گئے۔ اب ایک دفعہ پھر آپ کا رابطہ عالمِ بالا سے قائم ہوا اور دوسری وحی بہ این الفاظ نازل ہوئی:

"یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ ۙ (سورۃ المدثّر ۷۴: ۱-۴)

یوں آپ کو حکم دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچائیں۔ آپ نے جس قدر جلد ممکن ہوسکا امام علی علیہ السّلام کو اپنی رسالت کے بارے میں آگاہ کیا۔ یہ زمانہ امام علیؑ کے لڑکپن کا تھا اور وہ آنحضرتؐ کے زیرِ سایہ ہی پرورش پا رہے تھے۔ انھوں نے فوراً دعوتِ الٰہی پر لبّیک کہی۔ ساتھ ہی ساتھ حضرت خدیجہؓ بھی اپنے شوہرِ نامدار کی تعلیم پر ایمان لا کر دینِ اسلام میں شامل ہوگئیں۔ یہی وہ مقدّس ارواح تھیں جنھوں نے دنیا میں دین دارانہ معاشرے کی بنیاد رکھّی۔

آنحضرتؐ نے خاموشی سے اور مخفی طور پر ان مخصوص اشخاص تک اپنا پیغام پہنچانے کا کام جاری رکھّا جن کے متعلّق یہ توقّع ہوسکتی تھی کہ وہ آپ کی دعوت پر کان دھریں گے۔ رفتہ رفتہ آپ کے پیروؤں کی تعداد چالیس تک پہنچ گئی۔ یہ لوگ عموماً جوان تھے اور معاشرے کے مختلف طبقوں سے تعلّق رکھتے تھے۔ انھوں نے پہلے قرآن مجید اور مبادیاتِ اسلام کی تعلیم حاصل کی۔ وہ اپنی نمازیں خلوت میں مخفیانہ طور پر ادا کرتے تھے۔ ہر نومسلم کی تربیت کے لیے آنحضرتؐ ایک شخص کو نامزد فرما دیتے تھے جو پہلے سے

دولتِ ایمان سے مالا مال ہو چکا ہوتا تھا۔

دعوتِ ذوی العشیرہ

جب مخفی طور پر تبلیغ کی ابتدا ہوئے تین سال گزر گئے تو اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرمؐ کو اجازت دی کہ معاشرے میں مروّج قبائلی رسوم سے استفادہ کریں۔

"وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ○ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ (سورہ الشعرآء ۲۶ : ۲۱۴-۲۱۶)

چنانچہ آنحضرت نے اپنے اعزّہ واقربا کو دعوتِ طعام دی۔ اس دعوت کے سلسلے میں تقریباً چالیس افراد آپ کے گھر میں جمع ہو گئے۔ تاہم جونہی آپ نے وعظ و نصیحت کی ابتدا کی، آپ کے چچا عبدالعزّٰی المعروف بہ ابولہب نے آپ کو ٹوک دیا اور سب لوگ افرا تفری کے عالم میں چل دیے۔

آپ نے ایک دفعہ پھر اپنے رشتے داروں کی ضیافت کی۔ اِس دفعہ ابولہب کی مخالفت اور دھمکیوں کے باوجود آپ حاضرین تک پیغامِ حق پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم اس سارے مجمعے میں فقط امام علی علیہ السلام ہی ایک ایسے شخص تھے جنھوں نے آپ کی دعوتِ اسلام قبول کی اور پوری پوری حمایت کا یقین دلایا۔ اس پر آنحضرتؐ نے انھیں مخاطب کر کے فرمایا: "تم میرے بھائی، میرے وصی، میرے وزیر، میرے وارث اور میرے جانشین ہو۔"

دعوتِ عام

پھر اسلام کی علانیہ تبلیغ کا وقت بھی آگیا۔ اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرمؐ پر وحی نازل کی کہ:

"فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝"

(سورہ الحجر ۱۵ : ۹۴)

پس آنحضرتؐ صفا کی پہاڑی پر تشریف لے گئے اور قریش کو وہاں طلب فرمایا۔ جب وہ لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے انھیں مخاطب کرکے کہا:

"اگر میں تمھیں بتاؤں کہ دشمن تم پر حملہ آور ہوا چاہتا ہے تو کیا تم میری بات کا یقین کرلوگے؟"

سب نے یک زبان ہوکر کہا: "جی ہاں! ہم یقین کرلیں گے۔"

اس پر حضورؐ نے فرمایا: "میں تمھیں سخت عذاب کے بارے میں خبردار کرتا ہوں۔ اے عبدالمطّلب کے فرزندو! اے عبدِ مناف کے بیٹو! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ! اس سلسلے میں، مَیں اللہ تعالیٰ کے سامنے تمھاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔"

آپ کے اس اعلان سے ایک مسلسل کشمکش کی ابتدا ہوگئی لیکن اسلام کی نشرواشاعت کے سلسلے میں بھی اس کے بڑے دُوررس نتائج برآمد ہوئے۔ قریش نے اسلام کے نونہال کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی انتہائی کوششیں کیں۔ اُنھوں نے رسولِ اکرمؐ پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا۔ بہت سے نادار اور نحیف الجثّہ مسلمانوں کو شکنجوں میں کسا گیا

لیکن وہ راہِ حق پر ثابت قدم رہے۔ اِس پُر آشوب دَور میں حضرت ابوطالب نے آنحضرتؐ کی بھرپور مدد کی اور آپ کو قریش کی سازشوں سے بچایا۔

حبشہ کی جانب ہجرت

جب قریش کا ظلم وستم حد سے بڑھ گیا تو آنحضرتؐ نے کچھ مسلمانوں کو حبشہ کی جانب ہجرت کرنے کی اجازت دے دی چنانچہ یہ قافلہ جس میں اسّی مرد اور اٹھارہ عورتیں شامل تھیں، کشتیوں پر سوار ہو کر نجاشی کی مہمان نواز مملکت میں جا پہنچا۔

مقاطعہ اور محاصرہ

جب قریش مسلمانوں کو ہجرت سے باز رکھنے میں ناکام ہو گئے تو انھوں نے آنحضرتؐ کے خاندان یعنی بنی ہاشم سے معاشرتی مقاطعہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ مقاطعہ تین سال جاری رہا اور اس پورے عرصے میں بنی ہاشم ایک تنگ اور بے آب وگیاہ وادی میں محصور رہے جو شعبِ ابی طالب کہلاتی ہے۔ بالآخر جب دشمنانِ اسلام نے محسوس کیا کہ بنی ہاشم کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آئی تو مقاطعہ ختم کردیا۔

عام الحُزن

معاشرتی اور معاشی مقاطعہ ختم ہونے سے جو سکون آنحضرتؐ

کو اور آپ کے ساتھیوں کو میسّر آیا اس کی نوعیت قطعی عارضی تھی۔ اگلے سال ہی مسلمانوں کو اسلام کے مخلص ترین اور بارسوخ مؤید حضرت ابوطالب کی وفات کی شکل میں ایک گہرا صدمہ پہنچا۔ اس کے بعد جلد ہی آنحضرتؐ کی پیاری بیوی حضرت خدیجہؓ بھی رحلت فرما گئیں۔ جس سال میں یہ دونوں اندوہناک واقعات رونما ہوئے اُسے 'عام الحزن' یعنی غم کا سال کہا جاتا ہے۔

اہلِ طائف کا دعوتِ حق قبول کرنے سے انکار

قریش کے رویّے سے بددل ہو کر اور اپنے معزّز معاون اور غمگسار بیوی کی وفات سے پیدا شدہ افسردگی کی بنا پر رسولِ اکرمؐ نے اپنی توجّہ دوسرے قبیلوں کی جانب مبذول کی۔ چنانچہ آپ طائف تشریف لے گئے اور وہاں ایک ماہ قیام فرمایا۔ اس دوران میں آپ نے رؤسائے شہر سے ملاقاتیں کیں اور انھیں پیغامِ حق پہنچایا۔ تاہم یوں معلوم ہوتا تھا کہ ذہنیّت کے اعتبار سے طائف بھی شہر مکّہ کا ہی ایک حصّہ ہے۔ طائف کے لوگوں نے نہ صرف یہ کہ آپ کی دعوت رَد کر دی بلکہ بچّوں اور غلاموں کو اُکسایا جنھوں نے آپ پر پتھّروں کی بارش کر دی۔ چنانچہ آپ وہاں سے بے حد مغموم واپس ہوئے۔

آنحضرتؐ کا یہ دستور تھا کہ جب لوگ حج کے موسم میں مکّہ اور منیٰ کے مقامات پر جمع ہوتے تو آپ ان کے پاس تشریف لے جاتے اور انھیں دینِ حق کی دعوت دیتے۔

مدینہ کی جانب ہجرت

ایک دن آنحضرتؐ کی نظر چند ایسے لوگوں پر پڑی جن کا تعلق یثرب کے قبیلہ بنو خزرج سے تھا۔ آپ نے ان کے پاس جاکر چند آیاتِ قرآنی تلاوت فرمائیں۔ ان لوگوں پر کلام اللہ کا بہت اثر ہوا اور انھوں نے فوراً اسلام قبول کرلیا۔ اپنے شہر پہنچ کر انھوں نے اس سچّے دین کی تبلیغ شروع کردی۔ اس سے اگلے سال بارہ اشخاص یثرب سے آئے۔ اُنھوں نے منیٰ کے قریب عقبہ کے مقام پر آنحضرتؐ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ یہ واقعہ بیعتِ عقبۂ اولیٰ کہلاتا ہے۔ رسولِ اکرمؐ نے مصعب بن عمیر کو ان لوگوں کے ساتھ بھیجا تاکہ انھیں احکامِ دین سکھائیں اور اسلام کی تبلیغ کریں۔

تیسرے سال اہلِ یثرب کا ایک گروہ رات کے سنّاٹے میں آنحضرتؐ سے اسُی مقام پر ملا۔ انھوں نے آپ کو اپنے شہر آنے کی دعوت دی اور ہر قسم کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ حضورؐ کے چچا حضرت عبّاسؓ جو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے اس موقع پر موجود تھے۔ یہ واقعہ تواریخ میں بیعتِ عقبۂ ثانی کہلاتا ہے۔

اب رسولِ اکرمؐ نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر یثرب کی جانب ہجرت کریں۔ اس خوف سے کہ کہیں آنحضرتؐ بھی ہجرت نہ فرما جائیں قریش نے آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تاہم اللہ تعالیٰ نے آپ کو بروقت اس سازش سے آگاہ کردیا اور ہجرت کرنے کا حکم دیا۔

جو لوگ آپ کو قتل کرنے کے ارادے سے گھات لگائے بیٹھے تھے اُنھیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے آپ نے امام علی ابنِ ابی طالبؑ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا اور خود جناب ابوبکر کو ساتھ لے کر پوشیدہ طور پر مکّہ سے باہر نکلے۔ اُدھر جب قریش کو حقیقت کا پتا چلا تو انھوں نے بھی آپ کی تلاش شروع کر دی۔ چنانچہ تین دن تک آپ اور جناب ابوبکر 'ثور' نامی ایک غار میں پوشیدہ رہے اور جب قریش کی تگ و دَو میں سُستی آگئی تو باہر نکلے اور ایک غیر معروف راستہ اختیار کرتے ہوئے یثرب روانہ ہو گئے۔

کئی دن کی مسافت کے بعد آپ قبا کے مقام پر پہنچے جو یثرب (مدینہ) کی ایک نواحی بستی ہے۔ یہاں آپ امام علیؑ کی آمد کے انتظار میں دو دن ٹھہرے رہے۔ جب امام علیؑ بھی خانوادۂ رسولؐ کی خواتین کو ہمراہ لے کر قبا پہنچ گئے تو آنحضرتؐ مدینہ روانہ ہوئے جہاں پہنچنے پر آپ کا شاندار استقبال کیا گیا۔ ہجرت کے ساتھ اسلام کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

ریاستِ مدینہ

ہجرت کے بعد اسلام معاشرتی نظام کی تعمیر اور استحکام کے ایک نئے ارتقائی مرحلے میں داخل ہو گیا۔ اس سلسلے میں جو پہلا قدم اٹھایا گیا وہ مسجدِ نبویؐ کی تعمیر تھی۔ مسجد کے اردگرد کئی ایک حجرے بنائے گئے۔ شکل و صورت اور ساخت کے اعتبار سے یہ عمارت بالکل سادہ تھی۔ اس کی دیواریں مٹّی کی تھیں اور چھت پر

کھجور کی شاخیں ڈالی گئی تھیں۔

مسجد کی تعمیر کو دوسرے کاموں پر فوقیت دینے سے یہ حقیقت عملی طور پر واضح ہوگئی کہ دینِ اسلام کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر رکھی گئی ہے۔

کوئی قصرِ حکومت تعمیر نہیں کیا گیا۔ مسجد عبادت گاہ بھی تھی اور اسمبلی ہال بھی، کمرۂ عدالت بھی تھی اور مکتب بھی اور اسی سے افواج کے صدر مقام کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

برادرانہ بقائے باہمی کا ضابطہ

جب رسولِ اکرمؐ مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو وہاں کا قبائلی معاشرہ مختلف مفادات اور متضاد خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس معاشرے کے اہم ترین عناصر مندرجہ ذیل تھے:

ا۔ مسلمان

یہ مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھے۔ انصار (مددگار) کا لقب آنحضرتؐ نے مدینہ کے مشہور قبائل اوس اور خزرج کو دیا تھا کیونکہ انھوں نے آڑے وقت میں اسلام کی کما حقّہٗ مدد کی تھی۔ مہاجرین وہ سابق الاسلام اشخاص تھے جو کفّارِ مکّہ کے مظالم سے محفوظ رہنے کے لیے مدینہ چلے آئے تھے۔ اپنے دین و ایمان کی خاطر انھوں نے اپنا گھر بار، املاک اور اعزّہ و اقربا سے تعلّقات غرضیکہ سب کچھ تج دیا تھا۔

ہجرت کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے اور ایک نئے معاشرتی نظام کی بنیاد رکھنے کے لیے اسلام نے کئی ایک اقدامات کیے جن میں سے کچھ طویل مدّت کے لیے اور کچھ مختصر مدّت کے لیے تھے۔ سب سے پہلے اس نے عام حکمتِ عملی کے طور پر دینی مؤاخات کے نظریے کو اس کی انتہائی شکل میں رواج دیا۔

رسولِ اکرمؐ نے عہدِ جاہلیت کی نسلی تفاخر کی رسم کو یکسر موقوف کر دیا اور اسلامی زندگی میں تقویٰ کو انسان کی قدر و قیمت کا معیار قرار دیا۔ مہاجرین اور انصار کے مابین بھائی چارہ قائم کرکے آپ نے اس اصول کو عملی شکل دے دی۔ آپ نے ہر انصاری کو ایک مہاجر سے مؤاخات قائم کرنے کا حکم دیا۔ یہ حکم جنگِ بدر تک نافذ العمل رہا اور پھر منسوخ کر دیا گیا۔

جو بھائی چارہ آنحضرتؐ نے قائم کیا اس کے پیشِ نظر یہ جان کر کوئی تعجّب نہیں ہونا چاہیے کہ انصار میں سے کئی بزرگوار ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنی املاک کا نصف حصّہ اپنے مہاجر بھائیوں کو پیش کر دیا۔

اس نظام کے ذریعے صرف یہی نہیں کہ مہاجرین اور انصار کے مابین ایک عظیم الشّان برادرانہ بقائے باہمی کا سلسلہ قائم ہوگیا بلکہ قدرتی طور پر مہاجرین کے بہت سے اقتصادی مسائل بھی حل ہو گئے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مہاجرین نے انصار کے فیّاضانہ جذبے کا کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ہر ممکن کوشش کی کہ جس قدر جلد ہو سکے خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں اور انصاری بھائیوں کے دست نگر نہ رہیں۔

۲- یہودی

مدینہ کی معاشرتی زندگی کا دُوسرا عنصر یہودی تھے جن میں سے کچھ شہرِ مدینہ کے اندر اور کچھ مضافات میں سکونت پذیر تھے۔ مذہبی اعتقادات اور معاشرتی نظام کے لحاظ سے وہ مدینہ کے دوسرے باشندوں سے مختلف تھے۔

آنحضرتؐ نے یہودیوں کی تالیفِ قلوب کی خاطر چند خاص اقدامات کیے۔ میثاقِ مدینہ یعنی مدنی ریاست کے دستور کا بیشتر حصّہ جس سے آپ کی عظیم مدبّرانہ صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے انہی یہودیوں کے بارے میں تھا۔ اس کی چند دفعات ذیل میں درج ہیں:

(۱) تمام مسلمان خواہ ان کا تعلّق قبیلۂ قریش سے ہو یا شہرِ مدینہ سے اور تمام وہ اشخاص جنھوں نے ایک دوسرے سے ہمکاری کا عہد کیا ہو ایک قوم ہیں۔

(۲) ہر شخص، معاشرے میں اس کی حیثیت سے قطع نظر، جان اور مال کی حفاظت کا حقدار ہوگا۔ تمام مسلمان ایک عوامی رشتے میں منسلک ہیں۔

(۳) بنی عوف وغیرہ کی شاخوں سے تعلّق رکھنے والے تمام یہودی، مسلمانوں کے ساتھ ایک مخلوط قوم متصوّر ہوں گے۔ انھیں اپنی مذہبی رسوم پر عمل کرنے کی اتنی ہی آزادی ہوگی جتنی مسلمانوں کو ہوگی۔ جو لوگ زیادتی اور جُرم کے مرتکب ہوں گے اُنھیں سزا دی جائے گی۔

(۴) یہودی اور مسلمان اپنے اپنے مصارف برداشت کرتے ہوئے ان لوگوں کے دشمنوں کے خلاف جنگ کریں گے جنھوں نے اِس منشور

کو قبول کیا ہے۔

(۵) جو لوگ اس منشور کو قبول کریں ان کے مابین جھگڑوں اور اختلافات کی صورت میں رسولِ اکرمؐ کو ثالث تسلیم کیا جائے گا۔

۳۔ منافقین

تیسرا اہم عنصر منافقین کا تھا۔ یہ لوگ اسلام کے لیے عمومی جوش و خروش سے مجبور ہو کر ظاہری طور پر مسلمان ہو گئے تھے لیکن جب بھی موقع ملتا مسلمانوں کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے تھے۔

منافقین کی اسلام دشمنی کے کئی ایک محرّکات تھے۔ کچھ تو وہ لوگ تھے جو اسلام کو اپنے دنیاوی مفادات کے لیے مضر سمجھتے تھے اور کچھ وہ تھے جو اسے اپنے مشرکانہ اعتقادات اور رسوم کے لیے خطرہ خیال کرتے تھے۔ بعض لوگ اس مسئلے کو مقامی اور غیر مقامی کے نقطۂ نظر سے جانچتے تھے اور مہاجرین کو ناخواندہ مہمان تصوّر کرتے تھے۔ رسولِ اکرمؐ اس طبقے سے کافی رواداری برتتے تھے۔

ہجرت کی اہمیّت

اسلامی ریاست کے قیام کے لیے عسکری حکمتِ عملی کا وضع کرنا بھی ضروری تھا۔ اس کا خاص مقصد الٰہی ریاست کو سہارا دینا تھا۔ اسلامی ریاست کی کوشش یہ تھی کہ لوگوں تک سماوی نور کے پہنچنے میں جتنی رکاوٹیں حائل ہیں انھیں دُور کر دیا جائے۔ یہ حکمتِ عملی عسکری قیادت کی سطح پر ہی نہیں بلکہ نچلی سطح پر بھی سمجھی اور جانی پہچانی جاتی تھی۔

عملی مقاصد کے لیے ریاست کی عسکری پالیسی کی دو صورتیں تھیں یعنی:
(۱) جارحانہ اور (۲) دفاعی۔ لیکن دونوں حالتوں میں صف آرائی کی غایت ایک ہی تھی اور وہ تھی اسلامی دعوت کے راستے سے تمام رکاوٹوں کو دُور کرنا۔

صلحِ حدیبیہ

اسلام کی بیخ کنی کے لیے قریش کی آخری کوشش جنگِ خندق تھی۔ اس جنگ کے بعد سے وہ مرعوب ہو کر خاموش بیٹھے تھے۔ اب افواہیں گشت کرنے لگیں کہ وہ لوگ خفیہ طور پر خیبر کے یہودیوں سے گٹھ جوڑ کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ آنحضرتؐ نے ان کے اِس اقدام کا سدِّ باب کرنے اور قریش سے تصفیہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے آپ نے حج کے متبرّک ایام کا انتخاب کیا۔

آپ پندرہ سو ساتھیوں کے ہمراہ مکّہ معظّمہ روانہ ہوئے۔ سب مسلمان حالتِ احرام میں تھے اور ان کی تلواریں نیاموں میں تھیں۔ آنحضرتؐ نے اعلان فرما دیا تھا کہ ہم فقط حج کرنا چاہتے ہیں اور ہمارا جنگ وجدل کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تاہم قریش نے آپ کے اس اقدام کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا اور خالد بن ولید کی سربراہی میں ایک بہت بڑا لشکر آپ کو مکّہ معظّمہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے تعینات کر دیا۔

آنحضرتؐ نے مکّہ سے چند میل دُور حدیبیہ کے مقام پر توقّف فرمایا۔ چند دن بعد قریش نے اپنا ایک وفد آپ کے پاس بھیجا تاکہ آپ کے اصل ارادوں سے آگاہی حاصل کریں۔ گو وفد کے ارکان کو حضورؐ کے پُرامن مقاصد کا یقین ہو گیا لیکن قریش اپنی ضد پر اَڑے رہے۔

بعد میں رسولِ اکرمؐ نے عثمان بن عفّان کو اپنا سفیر بنا کر مکّہ بھیجا۔ قریش نے انھیں تین دن تک روکے رکھا۔ اس دَوران میں یہ افواہ اُڑ گئی کہ قریش نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا ہے۔

یہ اطّلاع ملنے پر آنحضرتؐ نے اس امر پر صحابۂ کرام سے تجدیدِ بیعت کرائی کہ ضرورت پڑنے پر وہ جنگ کے لیے تیّار رہیں گے۔ اس بیعت کو بیعتِ رضوان کہا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے اس بیعت میں حصّہ لیا اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ان کی تعریف فرمائی ہے۔

بڑی ردّ وکد کے بعد ایک صلح نامہ طے پایا جس کی رُو سے قریش کی بات بھی رہ گئی اور رسولِ اکرمؐ نے بھی وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو آپ چاہتے تھے۔ یہ صلح نامہ آپ کے حُسنِ تدبّر کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس کی اہم دفعات یہ تھیں:

(۱) جنگ دس سال کے لیے بند رہے گی۔

(۲) اگر قریش کا کوئی شخص اپنے قبیلے کی اجازت کے بغیر حضرت محمدؐ کے پاس چلا جائے گا تو اسے واپس کرنا ہوگا لیکن اگر کوئی مسلمان قریش کے پاس چلا جائے گا تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔

(۳) اگر کوئی قبیلہ حضرت محمدؐ سے یا قریش سے معاہدہ کرنا چاہے گا تو وہ ایسا کرنے کا مجاز ہوگا۔

(۴) حضرت محمدؐ اور ان کے اصحاب اس سال حج کیے بغیر واپس چلے جائیں گے۔ اگلے سال انھیں حج کرنے کی اجازت ہوگی لیکن وہ مکّہ میں زیادہ سے زیادہ تین دن قیام کریں گے اور اپنی تلواریں نیاموں میں رکھیں گے۔

بعض مسلمان جن میں عمر ابن الخطّاب پیش پیش تھے اس صلحنامے کی حقیقی اہمیّت کا ادراک نہ کرتے ہوئے اس کی افادیت کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے۔ وہ اس وقت تک اپنی رائے پر اَڑے رہے جب تک اللہ تعالیٰ نے اسے "فتحِ مبین" قرار نہیں دے دیا۔

اس صلح نامے کے اثرات بہت دُور رس تھے۔ اس نے عملی طور پر تبلیغِ اسلام کا راستہ صاف کر دیا۔ اس نے مخالفین کو موقع فراہم کیا کہ وہ اس دین کے بارے میں غور و فکر کریں جسے مٹانے کے لیے وہ اب تک سعیٔ لاحاصل کرتے رہے تھے۔ اس نے مسلمانوں کو بھی اس امر کی فرصت فراہم کی کہ وہ اپنے معاشرے اور ریاست کو مضبوط بنیادوں پر استوار کریں۔

نئے آفاق

اسلام نے مکّہ میں اپنی ابتدا سے ہی بالخصوص یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ ایک آفاقی دین ہے جس کا مقصد تمام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا اہتمام کرنا ہے۔

اسلام کا پیغام ہر انسان کو پھلنے پھولنے اور ترقّی کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اسلام ایک ایسا دین ہے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور بنی آدم کی تمام ضروریات پوری کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات سے اس کی آفاقیت کا اظہار ہوتا ہے۔

سابق الاسلام مسلمانوں کا تعلّق مختلف نسلوں سے تھا۔ ان میں عرب اور غیر عرب دونوں شامل تھے مثلاً حمزہ بن عبد المطّلب، عمّار بن یاسر، بلال حبشی اور صہیب رومی وغیرہ وغیرہ۔

اس حکمتِ عملی پر عمل کرتے ہوئے آنحضرتؐ نے قریش کے علاوہ دوسرے عرب قبائل سے رابطہ قائم کیا اور پھر دُنیا کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو خطوط لکھے۔ ان فرمانرواؤں میں روم اور ایران کے شہنشاہ بھی شامل تھے جو اس زمانے میں دنیا کی عظیم ترین سلطنتیں تھیں۔

فتحِ مکّہ

صلح حدیبیہ کے طے پانے کے دو سال بعد مکّہ فتح ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے خانہ کعبہ میں منصوب بُتوں کو پاش پاش کر دیا اور امام علی علیہ السّلام نے اس کام میں آپ کی مدد کی۔ بتوں کو توڑتے ہوئے آپ یہ فرماتے جاتے تھے: "حق آیا اور باطل کو شکست ہوئی اور باطل کو شکست ہونا ہی تھی"۔

رسولِ اکرمؐ نے شکست خوردہ دشمنوں سے بڑا فیّاضانہ سلوک کیا اور عام معافی کا اعلان کر دیا۔

حجّۃ الوداع

۱۰ھ ہجری میں رسولِ اکرمؐ نے بغرضِ حج مکّہ معظمہ تشریف لے جانے کا اعلان فرمایا۔ جب لوگوں کو آپ کے ارادے کا پتا چلا تو عرب کے اطراف و اکناف سے مدینہ میں جمع ہونا شروع ہو گئے تاکہ آپ کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوں۔ روایات کے مطابق ان حضرات کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ عرفات کے مقام پر آپ نے ایک فقید المثال خطبہ دیا جو تاریخِ اسلام میں بڑی اہمیّت کا حامل ہے۔ آپ نے سودی لین دین کو حرام قرار دیا اور اعلان فرمایا کہ نسل اور رنگ کے اختلاف سے قطع نظر

سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ کسی شخص کو بہ حیثیت عرب کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جس طرح مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں اسی طرح عورتوں کے مردوں پر بھی حقوق ہیں۔ اس خطبے کو بجا طور پر حقوقِ انسانی کا پہلا منشور قرار دیا گیا ہے۔

پیمانِ غدیر

حجۃ الوداع کے بعد مدینہ واپسی پر آنحضرتؐ نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ غدیرِ خم نامی ایک مقام پر توقف فرمایا۔ یہاں آپ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم دیا گیا کہ امام علی بن ابی طالب علیہ السّلام کو اپنا جانشین نامزد کریں اور اپنے بعد ان کے امیر المؤمنین ہونے کا اعلان کریں۔ اس دن بڑی شدید گرمی تھی اور وقت بھی تقریباً دوپہر کا تھا۔ یہ بات بھی خالی از علّت نہ تھی کہ اس اہم اعلان کے لیے آپ نے ایک مخصوص وقت اور مقام کا انتخاب فرمایا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ بہت سے مسلمان آئندہ آپ کی زیارت سے مشرف نہ ہوسکیں گے چنانچہ ان کے لیے یہ موقع حضورؐ کو آخری مرتبہ الوداع کہنے کا تھا۔ آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ آپ کے اردگرد جمع ہوجائیں۔ پھر آپ نے ایک خُطبہ دیا جس کے دوران یوں ارشاد فرمایا:

> "اللہ میرا آقا ہے اور میں تمام مومنین کا آقا ہوں۔ ان کے لیے لازم ہے کہ مجھے اپنے نفوس پر بھی ترجیح دیں۔ جو شخص مجھے اپنا آقا و مولا سمجھتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ علیؑ کو بھی اپنا آقا اور مولا سمجھے۔ یا اللہ! جو علیؑ کی حمایت کرے اُسے

دوست رکھ اور جو علیؑ سے دشمنی رکھّے اُسے دشمن رکھ۔"

خطبہ ارشاد فرمانے کے بعد آنحضرتؐ نے نمازِ ظہر ادا فرمائی اور پھر مسلمانوں کو حکم دیا کہ علیؑ کی اطاعت کا عہد کریں۔ جتنے مسلمان موجود تھے ان سب نے آپ کے حکم کی تعمیل کی۔

آخری وصیّت

مدینہ واپس آنے کے تھوڑے دنوں بعد ہی آنحضرتؐ کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ ایک دن جب علالت شدّت اختیار کرگئی تو آپ نے حکم دیا کہ: "مجھے قلم دوات اور کندھے کی ہڈی کا ٹکڑا لادو تاکہ میں اپنے بعد تمھاری رہنمائی کے لیے کچھ لکھوا دوں۔" یہ ارشاد فرمانے کے بعد آپ پر غشی طاری ہوگئی۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ حضورؐ ہذیانی کیفیت میں ہیں (نعوذ باللہ!)۔ جب آپ کو دوبارہ ہوش آیا تو جو لوگ موجود تھے انھوں نے دریافت کیا کہ آیا قلم دوات اور کندھے کی ہڈّی پیش کی جائے؟ آپ نے جواب دیا: "نہیں! جو کچھ تم نے کہا ہے اس کے بعد اس کی ضرورت نہیں۔ تاہم میں تمھیں ہدایت کرتا ہوں کہ میرے بعد میرے اہلِ بیتؑ سے اچّھا سلوک کرنا۔"

جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے امام علیؑ کو اس بارے میں ضروری ہدایات دیں کہ آپ کی وفات کے بعد اُنھیں کیا کرنا چاہیے۔ بالآخر اس حالت میں کہ آپ کا سرِ مبارک امام علیؑ کی گود میں تھا آپ کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

رسولِ اکرمؐ کی شخصیّت

قرآن مجید میں ایک مومن کے جو فضائل اور خوبیاں بیان کی گئی ہیں رسولِ اکرمؐ ان سب کا بہترین نمونہ اور کامل مرقّع تھے۔ آپ بیک وقت ایک عظیم مدبّر، پُرخلوص ترین عبادت گزار اور اہل وعیال اور عامّۃ النّاس سے حُسنِ سلوک کے قواعد وضوابط کے اوّلین رہنما تھے۔ آپ کی خوبیاں اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی نہیں گنوا سکتا اور اُس ذاتِ اقدس کا ارشاد ہے کہ آپ عالی ترین سیرت اور کردار کے مالک تھے۔ آپ کی ازواج میں سے ایک کا کہنا ہے کہ آپ کی سیرت قرآن مجید تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

"اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے۔"

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے:

"(اے رسول! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبّت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تم سے محبّت کرے گا۔"

لطفِ ربّانی کے زیرِ اثر آپ کی شخصیّت اس معاشرے کے افراد سے قطعاً منفرد تھی جس میں آپ کی پرورش ہوئی تھی۔ ابتدا ہی سے آپ اپنے بلند کردار کی وجہ سے معروف تھے حتّیٰ کہ جو مشرکین آپ سے واقف تھے وہ بھی آپ کو 'صادق' اور 'امین' کہہ کر پکارتے تھے۔

رسولِ اکرمؐ کی زندگی کا معاشرتی پہلو

امام حسین علیہ السّلام اپنے والد بزرگوار سے روایت کرتے ہوئے

فرماتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ ہمیشہ ہشّاش بشّاش رہتے تھے اور خوش خلقی کا اظہار فرماتے تھے۔ آپ نہ تو کسی سے چلّا کر بات کرتے اور نہ ہی کسی میں عیب نکالتے تھے۔ آپ کبھی بھی گھٹیا زبان استعمال نہیں کرتے تھے۔

انس بن مالک کہتے ہیں کہ: ''میں نے آنحضرتؐ کی دس سال تک خدمت کی۔ اگر مجھ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا جو آپ کو ناپسند ہوتا تو آپ کبھی بھی باز پرس نہ فرماتے۔''

رسولِ اکرمؐ بہ حیثیت قائد

اگر کوئی معقولیّت پسند شخص آنحضرتؐ کی شخصیّت کا مطالعہ ایک انسان، سربراہِ خاندان، معاشرے کے فرد، قاضی، منتظم، معلّم اور سپہ سالار کی حیثیت سے کرے تو وہ لازماً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ آپ کی ہمہ پہلو کاملیّت اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ آپ کو تائیدِ ایزدی حاصل تھی۔ تاریخِ انسانی کسی دوسرے ایسے شخص کی نشاندہی نہیں کرتی جو کمال کے اس رُتبے پر فائز ہوا ہو۔

عسکری سالار کی حیثیت سے آپ دلاور، جری اور دُور اندیش تھے۔ آپ کو فنِ حرب پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا۔ آپ ہر عسکری حرکت کی پیش از پیش منصوبہ بندی کرتے تھے۔ آپ نے ایک مختصر اور بے حد کم سازوسامان سے لیس فوج کے ساتھ بدر کا معرکہ سر کیا۔ اُحد میں نقصان اٹھانے کے باوجود آپ پوری طرح ثابت قدم رہے۔ یہ آپ کی ذاتی جُرات اور دلاوری ہی تھی جس کی بدولت حنین کے میدان میں شکست، فتح میں تبدیل ہوگئی۔ غزوۂ خیبر اور فتحِ مکّہ کے موقع پر آپ نے ناگہانی حملے کی

حکمتِ عملی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ کئی مواقع پر آپ نے مخصوص جنگی چالیں چلیں تاکہ دشمن پریشان ہو جائے اور اس کے حوصلے پست ہو جائیں۔

جانشینانِ رسولؐ

یہ عام دستور ہے کہ اگر کوئی شخص کسی قوم یا ادارے کا انتظامی سربراہ ہو اور کسی وجہ سے عارضی طور پر اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تو وہ اپنا جانشین یا نائب مقرّر کرتا ہے اور انتظامی امور اس کے سپرد کر دیتا ہے۔ وہ یہ خطرہ ہرگز مول نہیں لے سکتا کہ قوم یا ادارے کو کسی منتظم کے بغیر چھوڑ دے۔ پیغمبرِ اسلام بھی اس مسئلے کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے چنانچہ جونہی کوئی شہر یا قریہ اسلامی قلمرو میں شامل ہوتا آپ اس کا منتظم مقرّر فرما دیتے۔ جب کبھی آپ اسلامی سپاہ کو کسی لڑائی میں شرکت کا حکم دیتے تو اس کا سالار نامزد کر دیتے اور بعض اوقات کئی ایک متبادل سالاروں کا تقرّر فرماتے۔ علاوہ ازیں جب بھی آپ سفر پر روانہ ہوتے یا کسی جنگ میں بنفسِ نفیس شرکت کا ارادہ فرماتے تو اپنی غیر موجودگی میں مدینہ منوّرہ کا نظم و نسق چلانے کے لیے ایک جانشین مقرّر کر دیتے۔ رسولِ اکرمؐ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھے کہ آپ کے وصال کے بعد اُمّتِ مُسلمہ کو الٰہی قوانین کے نفاذ اور اسلامی مقاصد کی پیشرفت کے لیے ایک معصوم سربراہ کی ضرورت ہوگی۔ حضورؐ یہ بھی جانتے تھے کہ ایک معصوم

سربراہ کی عدم موجودگی میں ملتِ اسلامی کے لیے ایک طاقتور اور خوشحال قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ممکن نہیں۔

لہٰذا یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ رسولِ اکرمؐ جن کی زندگی کا حاصل ہی اسلام کی حفاظت اور سربلندی تھا، حق و صداقت کے اس نرم و نازک پودے کو حفاظتی تدابیر کے بغیر اور خطرات میں گھرا انہیں چھوڑ سکتے تھے۔

یہ امر بھی ناقابلِ تردید ہے کہ ایک نبی کے جانشینوں کا علم، تقویٰ اور عصمت کے فضائل سے مُزیّن ہونا ضروری ہے لہٰذا ان جانشینوں کا انتخاب عوام کی صوابدید پر چھوڑ دینا بھی ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف ذاتِ الٰہی کو ہی معلوم ہے کہ اِن خوبیوں کے حامل کون اشخاص ہیں اور لوگ باہمی مشاورت یا انتخاب کے ذریعے کسی شخص کو ان اوصاف سے متّصف نہیں کرسکتے لہٰذا یہ امر بدیہی ہے کہ ایک نبی کے جانشین کا تقرّر خدائے بزرگ و برتر ہی کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام نے اپنی ساری زندگی میں بالعموم اور زندگی کے آخری سال میں جب کہ آپ کو جلد ہی دُنیا سے تشریف لے جانے کا یقین تھا، بالخصوص امام علی علیہ السّلام کو مختلف مواقع پر اپنے جانشین کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ ان میں سے ایک ایسا موقع غدیرِ خم کا تھا جس کا واقعہ مشہور و معروف ہے اور کتبِ تواریخ میں بالتفصیل درج ہے۔

یہ واقعہ آنحضرتؐ کی زندگی کے آخری ایّام میں اس وقت پیش آیا جب آپ حجّۃ الوداع کی ادائیگی کے بعد مدینہ واپس تشریف لارہے تھے چنانچہ اسی سفر کے دوران غدیرِ خم کے مقام پر آپ نے لاکھوں آدمیوں کے

مجمعے میں امام علی علیہ السّلام کے اپنے جانشین کے طور پر تقرری کا اعلان فرمایا۔

بدقسمتی سے بعض لوگ آنحضرتؐ کی اس وصیّت پر عملدرآمد میں حارج ہوئے اور یوں ملّتِ اسلامیہ میں باہمی نزاع اور کشمکش کا بیج بو دیا۔

امام علی علیہ السّلام کے بعد آنے والے گیارہ ائمہؑ اہلِ بیتؑ میں سے بھی ہر ایک کو اس کے پیشرو امام نے بحکمِ الٰہی نامزد فرمایا۔ ان نامزدگیوں کے بارے میں روایات کا سلسلۂ اسناد ہماری مستند کتبِ احادیث و روایت میں درج ہے۔

جیسا کہ پیشتر بیان ہو چکا ہے ائمہ علیہم السّلام کا انتخاب فقط آنحضرتؐ اور پیشرو امام کی جانب سے نامزدگی کے ذریعے ہوتا ہے اور فی الحقیقت یہ تقرّر منجانب اللہ ہوتا ہے کیونکہ وہی ذاتِ اقدس کسی کے اس منصبِ جلیلہ کے لیے موزوں ہونے کے بارے میں فیصلہ کر سکتی ہے۔

علاوہ ازیں تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ امام علیؑ اور دوسرے ائمہ طاہرینؑ واقعی ان فضائل اور کمالات کے حامل تھے جنھوں نے بالتخصیص انھیں اس عالی منصب کا اہل بنا دیا تھا اور مسلمانوں کی رہبری ان کے لیے مختص کر دی تھی۔ کتبِ تواریخ اور اسلامی روایات کے ماخذ کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ امام علی علیہ السّلام اپنے علم، تقویٰ اور راستبازی کی بدولت آنحضرتؐ کے تمام صحابہ میں منفرد تھے اور کوئی دوسرا اُن کا ہم پلّہ نہ تھا۔

امام کے فرائضِ منصبی اور اوصاف

اسلام نے ایک رہبرِ ربّانی کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ بیحد

عالی اوصاف کا حامل ہو۔اسے علم و دانش اور ایثار و اخلاق کے معاملے میں دوسرے تمام لوگوں سے بلند تر سطح پر ہونا چاہیئے ۔ یہ بھی لازم ہے کہ وہ ہر قسم کے گناہ، اشتباہ اور سہو سے پاک ہو۔

نبیٔ اکرمؐ اور ائمۂ طاہرینؑ دینی رہنما ہونے کے علاوہ معاشرتی امور میں بھی عامّۃ النّاس کے پیشوا ہیں اور اس حیثیت میں انھیں نظم و نسق بھی سنبھالنا پڑتا ہے لہٰذا یہ لازم ہے کہ وہ ان ذمّے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی استعداد بھی رکھتے ہوں۔

ایک نبی دین کا بانی اور امام اس کا محافظ ہوتا ہے اور دونوں کا منجانب اللہ مامور ہونا ضروری ہے ۔ وحی صرف نبی پر نازل ہوتی ہے اور امام تمام تر علمِ نبوّت کا وارث ہوتا ہے۔گو امام پر وحی نازل نہیں ہوتی لیکن اسے نبی کے دینی نظام کی تمام جزئیات پر مکمّل دسترس حاصل ہوتی ہے۔

نبی اور امام دونوں کا ایک مخصوص تعمیری کردار ہوتا ہے اور اسلامی معاشرے کے مفاد میں خواہ کتنی بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے وہ اس سے پہلوتہی نہیں کرتے۔

ائمۂ طاہرینؑ نے دینِ اسلام کی خدمت میں جو لافانی کردار ادا کیا اُس کی اہمیّت سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ مثلاً امام حسین علیہ السّلام نے منافقین کے خلاف مبارزہ کر کے جور و استبداد کی بنیادیں ڈھا دیں۔امام جعفر صادق علیہ السّلام نے اسلامی تعلیمات اور دیگر علوم کی اشاعت کے سلسلے میں بے مثال خدمات انجام دیں ۔ امام علی رضا علیہ السّلام نے احکامِ دین کی مدافعت کی اور اسلام کے دُور دراز علاقوں میں پھیلنے کی وجہ سے جو خارجی افکار اس پر اثر انداز ہونے لگے تھے ان کے خلاف فکری رہبری

مہیا کی۔ یہی بات دوسرے ائمہؑ علیہم السّلام کے کردار پر بھی صادق آتی ہے جو انھوں نے اپنے اپنے دَور کے مخصوص حالات میں ادا کیا۔ پس ان عام فرائض کی بجاآوری کے علاوہ جو اُن سب پر بحیثیّت دینی پیشواؤں کے عائد ہوتے تھے ان میں سے ہر ایک نے اپنے دَور اور وقت کے حالات کے تقاضوں کے مطابق کچھ مخصوص خدمات بھی انجام دیں اور ان کی بجاآوری میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔

ہم یہ پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ امام کا تقرّر رسولؐ کے توسّط سے منجانب اللہ ہوتا ہے کیونکہ خدائے علیم وخبیر کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ کون عصمت کے رتبے پر فائز ہے اور اس سے کسی گناہ یا اشتباہ کا اظہار ممکن نہیں۔

پس نبی کی یہ بنیادی ذمّے داری ہے کہ وہ اپنے جانشین کو لوگوں سے متعارف کرائے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ اس کے کارِ رسالت میں کوتاہی کے مترادف ہوگا۔ اسی بنا پر ہمارا یہ پختہ اعتقاد ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے اپنے جانشین اور اُمّتِ مُسلمہ کے امام کو بنفسِ نفیس نامزد فرمایا۔

آنحضرتؐ نے محض اپنے فوری جانشین کی تقرّری ہی نہیں فرمائی بلکہ باقی ائمہؑ طاہرین کے اسمائے مبارکہ بھی گِنوا دیے۔ رسولِ اکرمؐ کی بہت سی احادیث ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں ائمہؑ علیہم السّلام کی تعداد بارہ بتائی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے بعد ہمارے بارہ خلفاء ہوں گے اور ان سب کا تعلق قبیلۂ قریش سے ہوگا۔ ان میں سے پہلے امام حضرت علی علیہ السّلام ہوں گے اور آخری امام حضرت محمّد مہدی موعودؑ ہوں گے۔ بعض دوسری احادیث میں سبھی بارہ خلفاء کے اسمائے گرامی بالتصریح بیان

فرمائے گئے ہیں۔

امیر المؤمنین امام علی علیہ السّلام

پہلے امام یعنی امام علی علیہ السّلام' رسولِ اکرمؐ کے چچازاد بھائی تھے۔ آپ ۱۳ رجب کو بروز جمعہ خانۂ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پرورش حضورؐ کے زیرِ سایہ ہی ہوئی جیساکہ آپ خود فرماتے ہیں:

"نبیٔ اکرمؐ نے مجھے اپنی آغوش میں پالا اور اپنے نوالوں سے مجھے کھلایا۔ آپ جہاں کہیں تشریف لے جاتے میں آپ کے پیچھے پیچھے اسی طرح جاتا تھا جیسے اونٹنی کا بچّہ اپنی ماں کے پیچھے جاتا ہے۔ ہر روز آپ کی گرامی قدر شخصیّت سے آپ کے کردار کا ایک نیا پہلو اُجاگر ہوتا اور میں اسے قبول کرتے ہوئے اس پر ایک فرمان کی حیثیت سے عمل کرتا۔"

اسی بِنا پر امام علی علیہ السّلام علمِ نبوّت کا خزانہ ہیں۔

امام علی علیہ السّلام نے جو دس سال رسولِ اکرمؐ کی صحبت میں گزارے ان کے نتیجے میں اُن کے اندر حضورؐ سے ملتی جلتی کردار، علم، ایثار، حِلم، شجاعت، سخاوت، خطابت اور فصاحت و بلاغت کی خوبیاں پیدا ہوگئیں۔ آپ بچپن ہی سے آنحضرتؐ کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوتے تھے۔ جیساکہ آپ نے خود فرمایا ہے:

"میں پہلا شخص تھا جس نے نبیٔ اکرمؐ کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں نماز پڑھی۔"

ایک مشہور مورّخ علاّمہ مسعودی کہتے ہیں کہ : "امام علیؑ نے اپنا تمام تر بچپن رسولِ مقبولؐ کی پیروی میں گزارا۔ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں (یعنی امام علیؑ کو) پاکیزہ اور مقدّس پیدا کیا اور صراطِ مستقیم پر قائم رکھا۔" گو امام علیؑ رسولِ کریمؐ کی دعوت پر اسلام قبول کرنے والوں میں سے بلا شبہ پہلے شخص ہیں تاہم اس حقیقت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے کہ آپ کی پرورش خود رسالتمآبؐ نے فرمائی اور آپ نے عبادتِ الٰہی سمیت حضورؐ کے ہر عمل کی پیروی کی، یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ پیدائشی مسلمان تھے۔

امام علی علیہ السّلام ہمیشہ رسولِ اکرمؐ کے ساتھ رہے تاکہ آپ کی مدد کریں اور دشمنوں سے آپ کی حفاظت کریں۔ جونہی حضرت جبرئیل علیہ السّلام آیاتِ قرآنی لے کر آتے امام علی علیہ السّلام ان کی کتابت کرتے اور پھر آنحضرتؐ سے ان کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتے۔ آپکو حضورؐ کا اتنا قُرب حاصل تھا کہ دن یا رات میں آنحضرتؐ پر جب کبھی کوئی آیت نازل ہوتی آپ (امام علیؑ) اُسے سُننے والے پہلے شخص ہوتے۔

رسولِ اکرمؐ نے امام علیؑ کے بارے میں فرمایا:

(ا) "اے علیؑ! تم اِس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی میرے بھائی ہو۔"

(ب) "میں عِلم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔"

علاّمہ مسعودی نے امام علیؑ کے کردار اور رُتبے کے بارے میں یوں رائے زنی کی ہے:

"اگر پہلا مسلمان ہونا، جلاوطنی میں رسولِ اکرمؐ کا ساتھی، دین کی خاطر جدّوجہد میں آپ کا مخلص شریکِ کار، زندگی میں قریبی رفیق اور

قرابت دار ہونا، حضورؐ کی تعلیمات اور احکامِ قرآنی کا صحیح علم رکھنا،
خواہشاتِ نفسانی کا ترک کرنا، عدل وانصاف برتنا، دیانت داری،
پاکیزگی اور سچّائی سے محبّت اور شریعت اور علم و دانش کا ادراک
فضیلت کی بنیاد بن سکتے ہیں تو سبھی کو چاہیے کہ علیؑ کو سب سے اوّل
مسلمان سمجھیں۔ ان فضائل کا ان کے پیشروؤں یا بعد میں آنے والوں
میں تلاش کرنا عبث ہوگا۔"

اپنی زندگی کے آخری سال میں رسولِ اکرمؐ بغرضِ حج مکّہ تشریف
لے گئے۔ مدینہ واپس جاتے ہوئے جب آپ غدیرِ خم کے مقام پر پہنچے
تو مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی:

"اے رسولؐ! جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل
کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو کیونکہ اگر تم ایسا نہیں کروگے
تو کارِ رسالت انجام دینے میں کوتاہی کروگے۔ اللہ تمھیں
لوگوں کے ضرر سے محفوظ رکھّے گا۔"

رسولِ اکرمؐ وہیں رک گئے اور سب مسلمانوں کو بھی رُکنے کا حکم
دیا۔ چنانچہ تقریباً ستّر ہزار اشخاص آپ کے گرد جمع ہوگئے۔ آپ نے
ایک منبر کی تیّاری کا حکم دیا۔ جب منبر تیّار ہوگیا تو آپ اس پر تشریف
لے گئے اور امام علیؑ کے بازو پکڑ کر بلند کیے تاکہ لوگ انھیں دیکھ سکیں
پھر حضورؐ نے فرمایا: "جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے
یا اللہ! جو علیؑ کو دوست رکھّے اُسے دوست رکھ اور جو علیؑ کو دشمن
رکھّے اُسے دشمن رکھ۔"

مشہور مورّخ گبن کہتا ہے: "علیؑ کی خاندانی وجاہت، رشتہ داری

اور کردار جنھوں نے اُنھیں اُن کے ہم وطنوں میں ممتاز کر دیا تھا ان کے لیے عرب کے خالی تخت پر دعوے کا جواز بن سکتے تھے۔ وہ ابوطالب کا فرزند ہونے کی حیثیت سے بنی ہاشم کے سردار، شہرِ مکّہ کے رئیس اور خانۂ کعبہ کے موروثی متولّی تھے۔"

امام علی علیہ السّلام شاعر، دلیر سپاہی اور ولی اللہ کے اوصاف سے متّصف تھے۔ آپ کی دانش کی خوشبو اب بھی آپ کے اخلاقی اور دینی اقوال کے مجموعے سے مہک رہی ہے۔ زبان اور شمشیر کی لڑائیوں میں آپ کا ہر مدِّمقابل آپ کی فصاحت و بلاغت اور شجاعت کے مقابلے میں زیر ہو جاتا تھا۔ رسولِ اکرمؐ کی بعثت کی پہلی گھڑی سے آپ کی تکفین و تدفین کے آخری مراحل تک آپ کے اُس عالی ہمّت رفیق نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا جسے آپ اپنا بھائی، جانشین اور موسیٰؑ ثانی (ع) کا وفادار ہارون (ع) کہتے ہوئے مسرّت محسوس کرتے تھے۔

۱۹ رمضان المبارک ۴۰ھ ہجری کو فجر کے وقت جب امام علیؑ مسجدِ کوفہ میں نماز ادا کر رہے تھے، ایک خارجی نے آپ کو ایک زہر آلود تلوار سے زخمی کر دیا۔ ۲۱ رمضان المبارک کو آپ کی شہادت واقع ہوگئی اور نجف الاشرف میں دفن ہوئے۔ آپ اللہ کے گھر یعنی خانۂ کعبہ میں پیدا ہوئے اور اللہ ہی کے گھر یعنی مسجدِ کوفہ میں شہید ہوئے۔ اللہ کے شیر اور مسلمانانِ عالم میں سب سے زیادہ جری اور کریم النّفس مسلمان نے اپنی شاندار زندگی کا آغاز اللہ اور رسول اکرمؐ پر ایمان سے کیا اور اسلام کی خدمت بجا لاتے ہوئے جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں انھیں مُردہ نہ کہو۔

نہیں۔ وہ زندہ ہیں لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے۔"

امام حسن علیہ السّلام

امام علی علیہ السّلام کے فرزندِ اکبر امام حسن علیہ السّلام ۱۵ رمضان المبارک ۳ھ ہجری کو مدینہ منوّرہ میں پیدا ہوئے۔ اپنے نواسے کی ولادت کی خوشخبری سُن کر رسولِ اکرمؐ اپنی دخترِ گرامی حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے گھر تشریف لائے۔ نومولود کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور اس کا نام 'حسن' رکھّا۔

دوسرے امامؑ کے بچپن کا پہلا ہفت سالہ دَور رسولِ اکرمؐ کے زیرِ سایہ گزرا۔ حضورؐ نے انھیں اعلیٰ خصوصیات اور ربّانی علوم سے اِس حد تک مزیّن کیا کہ آپ عِلم، حلم، عقل و دانش، سخاوت اور شجاعت میں منفرد مقام رکھتے تھے۔ آپ پیدائشی معصوم تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو قدّوسی علوم سے مالامال کر رکھا تھا۔

رسولِ اکرمؐ کے وصال کے بعد ایک ایسا واقعاتی دَور آیا جب اسلامی دنیا وسعت پسندی اور فتوحات کی شدید خواہش کی گرفت میں آگئی لیکن اس انقلابی دَور میں بھی امام حسنؑ امن پسندانہ طریقے سے اسلام کی نشر و اشاعت اور رسولِ اکرمؐ اور اپنے والد بزرگوار امام علی علیہ السّلام کی تعلیمات کی ترویج میں مشغول رہے۔

مسلمانوں کی اکثریت نے امام حسن علیہ السّلام کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ تاہم جونہی آپ نے ملّتِ اسلامیہ کی قیادت سنبھالی آپ کو امیرِ شام معاویہ بن ابوسفیان کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا جس نے آپ کے خلاف اعلانِ

جنگ کر دیا۔ چنانچہ رضائے الٰہی کی متابعت کرتے ہوئے اور مسلمانوں کے قتلِ عام کی ذمّہ داری سے بچنے کی خاطر آپ نے معاویہ سے ایسی شرائط پر صلح کر لی جن کے ذریعے اسلام بھی محفوظ رہا اور خانہ جنگی کا خطرہ بھی ٹل گیا۔ تاہم اس صلح نامے سے آپ کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ معاویہ کے حق میں مسلمانوں کی پیشوائی سے مستقل طور پر دست بردار ہو جائیں۔ اس کے برعکس اس کی غرض وغایت یہ تھی کہ اسلامی ورثے کا انتظام محض وقتی طور پر معاویہ کو منتقل کر دیا جائے اور یہ شرط رکھی گئی کہ معاویہ کے مرنے کے بعد نظم ونسق دوبارہ امام حسنؑ سنبھال لیں گے اور ان کے بعد امام حسینؑ ان کے جانشین ہوں گے۔ انتظامی ذمّے داریوں سے سبکدوش ہو جانے کے بعد امام حسنؑ بدستور دینی پیشوا رہے اور مدینہ میں قیام پذیر رہ کر اسلام اور تعلیماتِ رسولؐ کی نشر و اشاعت میں مشغول رہے۔

امام حسین علیہ السّلام

امام حسین علیہ السّلام ۳ شعبان المعظّم ۴ھ ہجری کو مدینہ منوّرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادتِ باسعادت پر رسولِ اکرمؐ نے پیشگوئی فرمائی کہ ہمارا دوسرا نواسا دینِ اسلام کو بچائے گا۔

یزید اپنے شیطانی کردار اور وحشیانہ چال چلن کے لیے بدنام تھا۔ وہ انتہائی درجے کا اوباش شخص تھا۔ چونکہ لوگ اس کے کردار سے واقف تھے لہٰذا انھوں نے ایک قرارداد منظور کی جس کی رُو سے معاویہ پر یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ یزید کو اپنا جانشین نامزد نہیں کرسکتا۔ علاوہ ازیں معاویہ نے

اپنے آپ کو اس امر کا بھی پابند کر رکھا تھا کہ وہ امام حسین علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کرے گا لیکن اِس عہد کا علم صرف چند اشخاص کو تھا۔ یہ عہد معاویہ نے امام حسن علیہ السلام سے کیا تھا لیکن بالآخر اُس نے اِس عہد کی خلاف ورزی کی اور یزید کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔

یزید نے امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا۔ اس دوران میں بہت سے لوگوں نے مَوت اور بربادی کے خوف سے اُس کے آگے اپنی گردنیں جھکا دی تھیں لیکن امام حسینؑ کا بیعت پر راضی ہونا ایک امرِ محال تھا۔ آپ نے فرمایا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے میں اللہ کی بجائے شیطان کے آگے سر نہیں جھکاؤں گا کیونکہ ایسا کرنا اپنے نانا حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے قائم کردہ نظامِ اسلام کو ملیا میٹ کرنے کے مترادف ہوگا۔)

شیطان صفت یزید کی بیعت سے انکار کرنے پر امام عالی مقامؑ کے خلاف تشدّد کا آغاز ہو گیا۔ چنانچہ آپ مدینہ میں عزلت گزینی کی زندگی گزارنے لگے لیکن وہاں آپ کو چین سے نہ رہنے دیا گیا اور مجبوراً آپ کو مکّہ منتقل ہونا پڑا۔ یہاں بھی آپ کو ہراساں کرنے کا سلسلہ جاری رہا اور یزید نے آپ کو حرمِ کعبہ میں قتل کرا دینے کا منصوبہ تیّار کیا۔

خانۂ خدا کی حرمت کی حفاظت کی خاطر امام حسین علیہ السّلام نے یومِ عرفہ سے ایک دن پہلے ہی مکّہ سے کوفہ چلے جانے کا فیصلہ فرمایا۔ جب آپ سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ امسال ہم مناسکِ حج کربلا میں بجا لائیں گے اور جو قربانی وہاں دی جائے گی وہ جانوروں کی نہیں بلکہ ہمارے اعزّہ واقربا اور چند جاں نثار دوستوں کی ہوگی۔

جب امام علیہ السّلام اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کربلا کے میدان

میں پہنچے تو آپ نے فرمایا : "یہی وہ سر زمین ہے ۔ کرب و بلا کی سر زمین" آپ گھوڑے سے اُترے اور اپنے ساتھیوں کو وہیں خیمے نصب کرنے کا حکم دیا اور فرمایا :

"یہاں ہم اور ہمارے بچّے شہید کیے جائیں گے ۔ یہی وہ مقام ہے جس کے بارے میں ہمارے نانا محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے پیش گوئی فرمائی تھی اور آپ کی پیش گوئی یقیناً پوری ہوگی"

۱۰ محرّم الحرام ۶۱ھ ہجری کی صبح کو امام حسینؑ نے یزید کی افواج پر نگاہ ڈالی اور دیکھا کہ ابنِ سعد اپنے سپاہیوں کو آپ کی جانب پیش قدمی کرنے کا حکم دے رہا ہے ۔ تب آپ نے اپنے اصحاب کو اکٹھّا کیا اور یوں ارشاد فرمایا :

"آج کے دن اللہ تعالیٰ نے ہمیں جہاد کی اجازت دی ہے اور وہ ہمیں ہماری شہادت کی جزا دے گا ۔ لہٰذا دشمنانِ اسلام کے خلاف استقلال اور پامردی سے لڑنے کے لیے تیّار ہو جاؤ ۔ اے عالی نفس اور خود دار بزرگوں کے فرزندو ! صبر سے کام لو ۔ موت محض ایک پُل ہے اور بہشت اور اس کے انعامات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تم اس پُل کو آزمائشیں اور مشقّتیں جھیل کر عبور کرو ۔ تم میں کون ایسا ہے جو اس قید خانے (دنیا) سے رہائی پاکر کاخِ بلند (بہشت) میں منتقل ہونے کی خواہش نہ رکھتا ہو ۔ ؟"

امامِ عالی مقامؑ کے ارشادات سُن کر آپ کے سب ساتھی وفورِ جذبات

سے بے قابو ہوگئے اور چلّا اُٹھے: "یا مولا! ہم آپ کے اور آپ کے اہلِ بیتؑ کے دفاع اور دینِ اسلام کی حفاظت کے لیے بالکل تیّار ہیں اور اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ ہیں۔"

امام حسینؑ نے دشمنانِ دین کے خلاف لڑنے اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے اپنے ساتھیوں کو ایک ایک کر کے میدانِ جنگ میں بھیجا۔ بالآخر جب سب بڑے اور بچّے اپنی جانیں راہِ حق میں نثار کر چکے تو آپ نے اپنے ششماہہ بچّے حضرت علی اصغرؑ کو بازوؤں پر اُٹھایا اور دشمنوں کے رُوبرُو لے جاکر اس کے لیے کچھ پانی طلب فرمایا کیونکہ وہ پیاس کے مارے جاں بلب تھا۔ تاہم شقی القلب یزیدی فوج کی جانب سے بچّے کی پیاس ایک زہر میں بجھے ہوئے تیر کے ذریعے بجھائی گئی۔ جو بچّے کے حلق اور امامِ مظلومؑ کے بازو میں پیوست ہو گیا۔ جب ششماہہ بچّہ بھی اللہ کی راہ میں قربان ہو گیا تو امام حسینؑ نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا:

"بارِ الٰہ! تُو نے اپنے حسینؑ کو جو کچھ عنایت فرمایا تھا وہ اُس نے تیری راہ میں پیش کر دیا ہے۔ یا الٰہ العالمین! تُو اس قربانی کو قبول کر کے اپنے حسینؑ کو سرفراز فرما۔ حسینؑ نے اب تک جو کچھ کیا ہے فقط تیری مدد اور تیرے فضل و کرم کی بدولت کیا ہے۔"

آخر کار امام حسینؑ خود میدانِ جنگ میں تشریف لائے اور دشمنوں سے لڑ کر شہید ہو گئے۔ آپ کی شہادت کے بعد یزیدی افواج نے آپ کا سر مبارک بدن سے جُدا کیا اور ایک نیزے پر چڑھا دیا۔ امام عالی مقامؑ

کے کٹے ہوئے سر نے سرِ نیزہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنی شروع کر دی اور "اَللّٰہُ اَکْبَر" کا ورد کیا یعنی سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو بزرگ ترین ہے۔

امام علی بن الحسین علیہ السّلام

امام علی بن الحسینؑ چوتھے امام ہیں۔ آپ ۱۵ جمادی الاوّل ۳۷ھ ہجری (۶۵۸ میلادی) کو مدینہ منوّرہ میں پیدا ہوئے۔ آپؑ زین العابدینؑ کے لقب سے مشہور ہیں۔

امام زین العابدین علیہ السّلام اپنے والد بزرگوار کے بعد تقریباً چونتیس سال زندہ رہے اور آپ نے اپنی ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور مناجات اور اپنے شہید والد کی یاد میں گزار دی۔ چونکہ آپ کا زیادہ تر وقت عبادات اور درگاہِ الٰہی میں سربسجود رہنے میں گزرتا تھا اس لیے آپ "سجّاد" کے لقب سے بھی ملقّب ہیں۔

حکومتِ وقت کی طرف سے امام عالی مقام کو اطمینان اور سکون سے عبادتِ الٰہی بجالانے یا لوگوں کو کھلّم کھلّا وعظ و نصیحت کرنے کا کوئی موقع نہ دیا گیا۔ چنانچہ حجّت اللہ فی الارض نے لوگوں کی رشد و ہدایت کا ایک تیسرا طریقہ اختیار کیا جو بہت مؤثر ثابت ہوا۔ یہ طریقہ انسان کے لیے بارگاہِ الٰہی میں رسائی حاصل کرنے کی خاطر روزانہ پڑھنے کے لیے مناجات اور دعاؤں کے ایک مجموعے کی تیاری تھی۔ اس انمول مجموعے کا نام "صحیفۃ الکاملہ" ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مؤثر دعائیں مانگنے کا ایک بیش قیمت خزانہ ہے جس کی زبان

بے نظیر ہے۔ ان دعاؤں کے فضائل اور برکات کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ان سے مستفید ہوئے ہوں۔ ان دعاؤں کے ذریعے امام علیہ السّلام عزلت گزینی میں بھی اپنے پیرؤوں کو ضروری ہدایات دیتے رہتے تھے۔

امام محمد الباقر علیہ السّلام

پانچویں امام حضرت محمّد علیہ السّلام، امام زین العابدین علیہ السّلام کے فرزندِ ارجمند تھے۔ آپ یکم رجب ۵۷ھ ہجری کو مدینہ منوّرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۴ھ ہجری میں ستّاون سال کی عمر میں اسی شہر میں وفات پائی اور بقیع کے قبرستان میں اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔ آپ "الباقر" کے لقب سے مشہور ہیں۔

امام محمّد الباقر علیہ السّلام نے تین سال کی عمر تک اپنے جدّ امجد امام حسین علیہ السّلام کی آغوشِ شفقت میں پرورش پائی۔ اس کے بعد آپ اپنے والدِ بزرگوار امام زین العابدینؑ کے زیرِ تربیت رہے۔

ایک معروف سنّی عالم ابن حجر عسقلانی نے امام علیہ السّلام کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

"امام محمّد الباقر علیہ السّلام نے عقل و دانش کے راز ہائے سربستہ افشا کیے ہیں۔ آپ ایک مقدّس اور بے حد باصلاحیّت اور روحانی پیشوا تھے اور اسی وجہ سے "الباقر" کے لقب سے ملقّب تھے جس کے معنی "علم کا شارح" کے ہیں۔ آپ کریم النّفس، نیک کردار، مقدّس رُوح کے مالک اور فطرتاً شریف طبع تھے اور آپ نے اپنی ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رسولِ اکرمؐ اور آپ کے اہلِ بیتِ

اظہار کی تعلیمات کی نشر واشاعت) میں گزار دی۔ امام علیہ السلام نے اہلِ ایمان کے دلوں پر علم و دانش اور ہدایت کے جو گہرے نقوش چھوڑے ہیں ان کا بیان کرنا ایک انسان کے لیے ممکن نہیں۔ زہد و تقویٰ، علم و دانش، دینی ریاضت اور اطاعتِ الٰہی کے بارے میں آپ کے اقوال کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ موجودہ کتاب ان کا احاطہ کرنے کے لیے ناکافی ہے۔" (صواعقِ محرقہ۔ صفحہ ۱۲۰)

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام

چھٹے امام حضرت جعفر علیہ السّلام ۱۷ ربیع الاوّل ۸۳ھ ہجری کو بروز جمعہ مدینہ منوّرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا مشہور لقب 'الصادق' ہے۔ آپ نے بارہ سال کی عمر تک اپنے جدِّ امجد امام زین العابدین علیہ السّلام کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی اور بعد ازاں اُنیس سال اپنے والد بزرگوار امام محمّد الباقر علیہ السّلام سے فیض حاصل کیا۔

آپ کی امامت کے زمانے میں تاریخِ اسلام میں بڑے اہم اور انقلاب آفریں واقعات رونما ہوئے۔ اسی دَور میں بنی اُمیّہ کے اقتدار کا خاتمہ ہوا اور بنی عبّاس کی خلافت قائم ہوئی۔ خانہ جنگی اور سیاسی تغیّرات کی بنا پر حکومت میں بڑی سرعت سے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ چنانچہ امام عالی مقامؑ نے عبدالملک سے لے کر مروان ابنِ حکم تک کا بنی امیّہ کا دَور دیکھا۔ جہاں تک عبّاسیوں کا تعلّق ہے امام علیہ السّلام، ابوالعبّاس السّفاح اور منصور دوانیقی کے ادوار تک زندہ رہے۔ بنوامیّہ اور بنو عبّاس کی سیاسی چپقلش کی وجہ سے امام صادق علیہ السلام کو موقع ملا

کہ یکسوئی سے عبادتِ الٰہی میں مشغول رہیں اور اسلام اور تعلیماتِ رسولؐ کی نشر و اشاعت کا مشن جاری رکھ سکیں۔

بنی امیّہ کا زوال اور عبّاسیوں کا اقتدار پر قبضہ تاریخ اسلامی کے دو بڑے اہم واقعات تھے۔ یہ بڑا افراتفری کا زمانہ تھا جب کہ مسلمانوں کے اخلاق بگڑ چکے تھے۔ رسولِ اکرمؐ کی تعلیمات سے لاپروائی برتی جارہی تھی اور طوائف الملوکی کا دَور دورہ تھا۔ اس ہولناک اندھیرے میں امام جعفر الصادق علیہ السّلام کی بابرکت ذات ایک روشنی کے مینار کی مانند تھی جو اردگرد پھیلے ہوئے بحرِ معاصی کی تاریکی پر ضوفشاں تھی۔ لوگ آپ کی ہمہ صفت موصوف اور قابلِ ستائش شخصیت کی جانب کھنچنے لگے۔ ابوسلمہ خلال نے آپ کو تختِ خلافت کی پیشکش بھی کی لیکن امام علیہ السّلام نے اپنے آباؤ اجداد کی مخصوص روایت کے مطابق اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور عبادتِ الٰہی میں مشغولیت اور اسلام کی خدمت کو دنیاوی حکومت پر ترجیح دی۔ اپنے بے مثل علم وفضل کی بنا پر آپ دیگر مذاہب مثلاً یہودیت اور عیسائیت کے علماء سے مناظروں اور مباحثوں میں ہمیشہ کامیاب رہے۔

اپنی ہمہ گیر فطری قابلیت اور مختلف علوم پر مکمّل طور پر حاوی ہونے کی بنا پر امام جعفر الصادق علیہ السّلام کو سارے عالمِ اسلام میں توقیر اور تعظیم سے دیکھا جاتا تھا چنانچہ شائقینِ علم دُور دُور سے آکر آپ کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ کرتے تھے حتیٰ کہ ان کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی۔

علمِ دینیات کے علماء اور ماہرین نے امام جعفر الصّادق علیہ السّلام

سے بہت سی روایات نقل کی ہیں۔ آپ کے شاگردوں نے مختلف علوم و فنون پر سینکڑوں کتابیں تالیف کیں۔ آپ نے فقہ، حدیث اور تفسیر پڑھانے کے علاوہ چند شاگردوں کو ریاضی اور کیمیا کی تعلیم بھی دی۔ ریاضی کا مشہور عالم جابر بن حیّان بھی امام علیہ السّلام کے شاگردوں میں سے تھا اور اس نے آپ کے علم و ارشادات سے استفادہ کرتے ہوئے چار سو سے زائد کتابیں مختلف موضوعات پر تصنیف کیں۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دنیائے اسلام کے تمام عظیم دانشور اپنے علم و فضل کے لیے اہلِ بیتِ رسولؐ کے مرہونِ منّت رہے ہیں۔ یہی وہ گھرانہ ہے جو ہر کہہ و مہ کے لیے علم و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

علّامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب "سیرت النعمان" میں یوں رقمطراز ہیں:

> "ابوحنیفہ ایک عرصۂ دراز تک امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کے حلقۂ درس میں حاضری دیتے رہے اور آپ سے کثیر مقدار میں فقہ اور حدیث کا بیش قیمت علم حاصل کیا۔ شیعہ اور سُنّی دونوں فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ ابوحنیفہ کے علم کا اہم ذریعہ اُن کا امام جعفر الصّادق علیہ السّلام سے ربط ضبط تھا۔"

امام علیہ السّلام نے اپنی تمام عمر دینی مواعظ اور رسولِ اکرمؐ کی تعلیمات کی نشر و اشاعت میں صَرف کردی۔ آپ کے بیکراں علم اور بے نظیر طریقۂ تدریس کی بنا پر لوگ آپ کے گرد جمع رہتے تھے اور آپ کی پوری تعظیم بجا لاتے تھے۔ یہی چیز عبّاسی فرمانروا منصور دوانیقی کے دل میں آپ کے خلاف بغض و عناد پیدا ہونے کا موجب بنی اور وہ آپ کی جان کے درپے ہوگیا۔

امام موسیٰ الکاظم علیہ السّلام

ساتویں امام حضرت موسیٰ بن جعفر علیہ السّلام ۷، صفر ۱۲۸ھ ہجری کو بروز اتوار ابواء کے مقام پر پیدا ہوئے۔

'الکاظم' آپ کا معروف لقب ہے۔ اپنی بے نظیر ریاضت اور عبادتِ الٰہی کی بنا پر آپ "عبد الصالح" کے لقب سے بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ آپ مجسّم سخاوت تھے اور کوئی سائل کبھی بھی آپ کے دروازے سے خالی ہاتھ نہیں گیا۔ آپ کا یہ فیض آپ کی وفات کے بعد بھی جاری تھا۔ آپ کے معتقدین آپ کے مزارِ اقدس پر حاضری دے کر اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجات طلب کرتے اور دلی مرادیں پاتے تھے۔

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے ۱۵، رجب ۱۴۸ھ ہجری کو جامِ شہادت نوش فرمایا اور اسی دن سے امام موسیٰ الکاظم علیہ السّلام منصبِ امامت پر فائز ہوئے۔ آپ کی امامت کا دَور پینتیس سال تک جاری رہا۔ اپنی امامت کے پہلے دس سال امام موسیٰ الکاظم علیہ السّلام نے قدرے سکون سے گزارے اور منصبِ امامت کی ذمّے داریاں پوری کرنے اور رسولِ اکرمؐ کی تعلیمات کی نشر و اشاعت میں مشغول رہے لیکن اس کے بعد جلد ہی حکّامِ وقت کے ظلم و جور کا دَور شروع ہو گیا اور آپ کی بقیہ زندگی کا بیشتر حصّہ قید خانے کی سلاخوں کے پیچھے گزرا۔

آپ کے جُود و سخاوت کا یہ عالَم تھا کہ آپ ہمیشہ خفیہ طور پر مدینہ کے فقراء اور مساکین کی مدد فرمایا کرتے تھے اور انھیں نقدی، اناج، لباس اور دوسری ضروریاتِ زندگی مہیّا کرتے تھے۔ امام علیہ السّلام کی زندگی میں

ان لوگوں کے لیے یہ بات ایک معمّہ بنی رہی کہ آخر اُن کا نامعلوم محُسن کون ہے لیکن آپ کی شہادت کے بعد حقیقت سب پر روشن ہوگئ۔

امام جعفر الصادق علیہ السّلام کو حکّام وقت کی جانب سے اس امر کی اجازت نہ تھی کہ آپ کسی مجمعے سے خطاب کرسکیں۔ امام موسیٰ الکاظم علیہ السّلام کو بھی وقت اور حالات نے اتنی فرصت نہ دی کہ اپنے پیروؤں کی تعلیم اور ہدایت کے لیے کوئی ادارہ قائم کرسکیں تاہم آپ نے ارشاد و ہدایت کا مشن خاموشی سے جاری رکھّا۔ آپ نے چند کتابیں بھی تصنیف فرمائیں جن میں سے "مسندِ امام موسیٰ الکاظمؑ" بہت مشہور ہے۔

امام علی الرضا علیہ السّلام

آٹھویں امام حضرت علی بن موسیٰ علیہ السّلام ۱۱ ذی قعدہ ۱۴۸ھ ہجری کو مدینہ منوّرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کو 'ابوالحسن' بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کا مشہور لقب "الرضا" ہے۔

امام علی الرضا علیہ السلام نے پینتیس سال تک اپنے والد بزرگوار سے تربیت حاصل کی۔ آپ کی خداداد ذہانت اور دینی معاملات میں ذکاوت پر امام موسیٰ الکاظم علیہ السّلام کی تعلیم و تربیت سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی اور آپ کو ایک بے نظیر روحانی پیشوا بنا دیا۔ امام الرضا علیہ السّلام رسولِ اکرمؐ کے زہد و تقدّس اور امام علی علیہ السّلام کی دلاوری اور سخاوت کی زندہ مثال تھے۔

امام الرضا علیہ السّلام نے کریم النفسی اور ذہانت کی خوبیاں اپنے آباؤاجداد سے ورثے میں پائی تھیں۔ آپ ایک ہمہ صفت موصوف

انسان تھے اور کئی ایک زبانوں پر مکمّل عبُور رکھتے تھے۔ ابنِ اثیر جزیری نے بالکل صحیح کہا ہے کہ امام الرضا علیہ السّلام دوسری صدی ہجری کے بزرگ ترین دانشمند، ولی اللہ اور عالِم تھے۔

امام الرضا علیہ السّلام کے تقویٰ، عِلم و دانش، حِلم، شائستگی اور عظیم شخصیّت کی بِنا پر مامون الرّشید بھی آپ کی تعظیم کرنے پر مجبُور ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اپنے بعد آپ کو تختِ خلافت کے لیے ولی عہد نامزد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پیشتر اُس نے ۲۰۰ھ ہجری میں خاندانِ بنی عبّاس کے تمام افراد کو بلا بھیجا تھا۔ اس دعوت کے نتیجے کے طور پر تینتیس ہزار عبّاسی دارالخلافت میں جمع ہو گئے اور ان کی خاطر تواضع شاہی مہمانوں کی حیثیّت سے کی گئی۔ اس دوران میں مامون نے ان سب کی عادات و خصائل کا بغور مطالعہ کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ ان میں سے کوئی ایک بھی اس قابل نہیں کہ حکومت کی ذمّے داریاں سنبھال سکے۔ چنانچہ ۲۰۱ھ ہجری میں اس نے اِن لوگوں کے ایک مجمعے میں تقریر کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا کہ اُس کی نظر میں ان میں سے کوئی بھی اس کا جانشین بننے کا اہل نہیں۔ اسی مجمعے میں اس نے لوگوں سے مطالبہ کیا کہ وہ امام الرضا علیہ السّلام کی بیعت کریں اس نے یہ اعلان بھی کیا کہ امام علیہ السّلام کے لباس کی طرح آئندہ شاہی ملبوسات کا رنگ بھی سبز ہو گا۔ ایک شاہی فرمان بھی بایں مضمون جاری کیا گیا کہ امام الرضا علیہ السّلام، مامون کے جانشین ہوں گے اور آپ کا لقب 'علی الرضا من آلِ محمدؐ' ہو گا۔

جانشینی کے اعلان کے بعد بلاشبہ امام الرضا علیہ السّلام کو شاندار دنیاوی زندگی گزارنے کے تمام مواقع میسّر آ سکتے تھے۔ تاہم آپ نے مادّی

آرام و آسائش کی جانب کوئی توجّہ نہ دی اور رسولِ اکرم ؐ کی تعلیمات اور قرآنِ مجید کے احکامات کے مطابق صحیح اسلامی نقطۂ نظر کی ترویج میں منہمک رہے۔ آپ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ عبادتِ الٰہی اور خدمتِ خلق میں گزارا۔

امام محمد التقی علیہ السّلام

نویں امام حضرت محمّد بن علی علیہ السّلام ۱۰ رجب ۱۹۵ھ ہجری (مطابق ۸۱۱ میلادی) کو بروز جمعہ مدینہ منوّرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا مشہور لقب 'التقی' ہے۔

امام محمّد التقی علیہ السّلام نے چار سال کی عمر تک اپنے والد بزرگوار امام علی الرضا علیہ السّلام کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ پھر حالات کے تقاضے کے مطابق امام الرضا علیہ السّلام اپنے فرزندِ عزیز کو مدینہ میں چھوڑ کر خود خراسان منتقل ہو گئے۔ امام الرضا علیہ السّلام کو حاکمِ وقت کے غدّارانہ کردار کا پورا پورا علم تھا اور آپ جانتے تھے کہ اب آپ کی مدینہ واپسی کا کوئی امکان نہیں لہٰذا آپ نے مدینہ چھوڑنے سے پہلے محمّد التقی علیہ السّلام کو اپنے جانشین کے طور پر امام نامزد کر دیا اور تمام ظاہری اور باطنی علوم آپ کو منتقل کر دیے۔ امام محمد التقی علیہ السّلام نے باقی سب ائمۂ طاہرین سے کم عمر پائی۔ آپ آٹھ سال کی عمر میں منصبِ امامت پر فائز ہوئے اور پچیس سال کی عمر میں زہر خورانی کی وجہ سے جامِ شہادت نوش فرمایا تاہم اپنی نوعمری کے باوجود آپ علم و دانش کا بحرِ ذخّار تھے اور آپ کے گوناگوں فضائل کی بنا پر لوگ آپ کی بے حد تعظیم و تکریم کرتے تھے۔

امام علیہ السّلام، رسولِ اکرمؐ کے خلق و تلطّف اور امام علی علیہ السّلام کے فضائل کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ جوانمردی، دلاوری، عِلم و دانش، عفوو درگزر اور بُردباری کی خوبیاں آپ کو ورثے میں ملی تھیں۔ ہر ایک سے بِلا تفریق تواضع اور خوش اخلاقی سے پیش آنا، محتاجوں کی مدد کرنا، ہر حالت میں مساوات برقرار رکھنا، سادہ زندگی گزارنا، یتیموں، غریبوں اور بے خانماں لوگوں کی مدد کرنا، شائقینِ عِلم کو عِلم و دانش سے بہرہ ور کرنا اور لوگوں کو راہِ راست کی جانب بلانا آپ کی فطرت اور کردار کی نمایاں خصوصیات تھیں۔

مامون الرشید کو اس بات کا احساس تھا کہ اپنی حکومت کے استحکام کے لیے اسے لازمی طور پر ایرانیوں کی حمایت حاصل کرنی چاہیے اور ایرانیوں کا میلان شروع سے اہلِ بیتؑ کی جانب تھا لہٰذا وہ سیاسی نقطۂ نگاہ سے اس امر پر مجبور ہو گیا کہ بنی عبّاس کی بجائے بنی فاطمہ سے میل جول بڑھائے اور یوں شیعیوں کی حمایت حاصل کرے۔ گو امام الرضا علیہ السّلام دلی طور پر اس کا جانشین بننے پر راضی نہ تھے پھر بھی اس نے انھیں اپنا ولی عہد نامزد کر دیا اور اپنی بہن اُمِّ حبیبہ کی شادی بھی اُن سے کر دی۔

مامون کو توقّع تھی کہ امام الرضا علیہ السّلام کاروبارِ سلطنت میں اس کے مددگار ثابت ہوں گے لیکن جب اسے یہ علم ہوا کہ آپ کو حکومت سے کوئی دلچسپی نہیں اور عامّۃ النّاس آپ کی روحانی عظمت کی بنا پر آپ کے گرویدہ ہو رہے ہیں تو اس نے آپ کو زہر دلوا دیا۔ تاہم جس ضرورت کے تحت اس نے امام علی الرضا علیہ السّلام کو اپنا جانشین اور ولی عہد نامزد کیا تھا وہ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی لہٰذا اس نے اپنی بیٹی امّ الفضل کو امام محمد التقی

علیہ السلام کی زوجیت میں دینے کا فیصلہ کیا اور اس غرض سے آپ کو مدینہ سے عراق بُلا بھیجا۔

جب بنی عباس کے افراد کو پتا چلا کہ مامون اپنی بیٹی کو امام محمّد التقی علیہ السلام سے بیاہنا چاہتا ہے تو وہ بے حد برافروختہ ہوئے چنانچہ ان لوگوں کے سربرآوردہ اشخاص ایک وفد کی شکل میں اُس سے ملے تاکہ اُسے اس ارادے سے باز رکھ سکیں تاہم مامون، امام محمّد التقی علیہ السّلام کے علم و دانش اور فضائل کا معترف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گو امام علیہ السّلام ابھی نوعمر ہیں تاہم وہ اپنے والد بزرگوار کے حقیقی معنیٰ میں جانشین ہیں اور دنیائے اسلام کے متبحّر ترین دانشور بھی اُن کے مدِ مقابل نہیں ہو سکتے۔

جب عبّاسیوں نے دیکھا کہ مامون کے خیال کے مطابق امام محمد التقیؑ کی فضیلت کی بنیاد اُن کے علم و فضل پر ہے تو انھوں نے بغداد کے سب سے بڑے عالم اور فقیہ یحییٰ ابن اکثم کو آپ سے بحث و مباحثہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔

مامون نے اس سلسلے میں ایک اعلان جاری کیا جس کی رُو سے مناظرے کی خاطر ایک بہت بڑے جلسے کا اہتمام کیا گیا اور مملکت کے مختلف خطّوں سے لوگ اس جلسے میں شرکت کے لیے جمع ہو گئے۔ عمائدینِ سلطنت کے علاوہ نو سو نشستیں فقط علماء اور دانشوروں کے لیے مخصوص کی گئیں۔ لوگ حیران تھے کہ ایک نوعمر بچّہ کیونکر عراق کے عظیم ترین عالم اور قاضی القضاۃ سے مقابلہ کر سکے گا۔

امام محمد التقی علیہ السلام، مامون کے پہلو میں تخت پر تشریف فرما تھے اور یحییٰ بن اکثم کی نشست آپ کے سامنے تھی۔ یحییٰ نے امام علیہ السّلام

سے سوال کرنے میں پہل کی اور کہا :

" کیا آپ اجازت دیں گے کہ میں آپ سے ایک سوال کروں ؟ "

امام علیہ السّلام نے اپنے آباؤ اجداد کے مخصوص لہجے میں جواب دیا:

" تم جو چاہو پوچھ سکتے ہو "

تب یحییٰ نے امام علیہ السّلام سے کہا : " جو شخص بحالتِ احرام شکار کرے اس کے بارے میں آپ کا کیا فتویٰ ہے ؟ " (شرعاً حج ادا کرنے والے شخص کے لیے شکار کھیلنا منع ہے)

امامِ عالی مقامؑ نے فوراً جواب دیا : " تمھارا سوال مبہم اور گمراہ کن ہے تمھیں بالصراحت بتانا چاہیئے تھا کہ آیا اس شخص نے خانہ کعبہ کی حدود میں شکار کیا یا اس سے باہر کیا۔ آیا وہ پڑھا لکھا تھا یا اَن پڑھ تھا۔ آیا وہ غلام تھا یا آزاد تھا۔ آیا وہ بالغ تھا یا نابالغ تھا۔ آیا اس نے یہ فعل پہلی دفعہ کیا یا پہلے بھی اس کا ارتکاب کر چکا تھا۔ آیا اُس نے کسی پرندے کا یا کسی اور جاندار کا شکار کیا۔ آیا جس جاندار کا شکار کیا گیا وہ بڑا تھا یا چھوٹا تھا۔ آیا اُس شخص نے دن میں شکار کیا یا رات میں کیا۔ آیا اُس نے اپنے فعل سے توبہ کر لی یا اس کے ارتکاب پر بضد رہا۔ آیا اُس نے چھپ چھپا کر شکار کیا یا کھُلّم کھُلّا کیا اور آیا اُس نے احرام عمرہ کے لیے باندھا تھا یا حج کے لیے باندھا تھا۔ جب تک ان تمام امور کی وضاحت نہ کی جائے اس سوال کا کوئی جواب دینا ممکن نہیں "

قاضی یحییٰ ، امام علیہ السّلام کے ارشادات سُن کر مبہوت رہ گیا اور یہی حالت تمام حاضرینِ جلسہ کی ہوئی۔ مامون کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اُس نے اپنی مسرّت کے جذبات کا اظہار اِن الفاظ میں کیا :

"شاد باد! شاد باد! یا ابوجعفر (احسنت، احسنت، یا ابوجعفر) آپ کے علم و فضل کا جواب نہیں!"

چونکہ مامون کی خواہش تھی کہ امام علیہ السلام کے مدِمقابل کے علم و فضیلت کا کھوکھلاپن مکمل طور پر الم نشرح ہو جائے اس لیے اس نے آپ سے مخاطب ہو کر کہا: "آپ بھی یحییٰ ابنِ اکثم سے چند سوالات کریں۔"

یحییٰ نے بھی نیم دِلی سے امام علیہ السلام سے عرض کیا: "جی ہاں! آپ بھی مجھ سے چند سوالات پوچھیں۔ اگر مجھے ان کا جواب معلوم ہوا تو عرض کر دوں گا ورنہ آپ سے استدعا کروں گا کہ آپ خود بتلا دیں۔"

تب امام عالی مقامؑ نے یحییٰ سے ایک مسئلہ دریافت کیا جس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ بالآخر آپ نے خود اس کا جواب مرحمت فرمایا۔

اس کے بعد مامون نے حاضرینِ جلسہ سے یوں خطاب کیا: "کیا میں نے تمھیں نہیں بتایا تھا کہ امام علیہ السلام کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے گنجینۂ علم کے طور پر منتخب فرمالیا ہے؟ کیا دنیا میں کوئی شخص ایسا ہے جو اِس گھرانے کے بچّوں کا بھی مقابلہ کر سکے؟"

سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔ "بلاشبہ امام محمّد التقی علیہ السلام کا کوئی ہم پلّہ نہیں۔"

اسی مجلس کے دوران میں مامون نے اپنی بیٹی اُمّ الفضل کا نکاح امام محمّد التقی علیہ السلام سے کر دیا اور اس تقریب کی خوشی میں بڑی فراخدلی سے اپنی رعایا میں تحائف اور انعام و اکرام تقسیم کیے۔ شادی

کے ایک سال بعد امام علیہ السّلام اپنی اہلیہ کے ہمراہ واپس مدینہ تشریف لے گئے اور لوگوں کو احکامِ الٰہی کی تعلیم دینے میں مصروف ہو گئے۔

امام علی النقی علیہ السّلام

امام علی النقی علیہ السّلام ۱۵ ذی الحجہ ۲۱۲ھ ہجری کو بروز جمعہ مدینہ منوّرہ کے نواح میں واقعِ ایک مقام صُریہ میں پیدا ہوئے۔

اپنے والد بزرگوار کی طرح امام علی النقی علیہ السّلام بھی بچپن میں ہی منصبِ امامت پر فائز ہوئے۔ اپنے والد امام محمّد التقی علیہ السّلام کی شہادت کے وقت آپ کی عمر چھ سال تھی۔ مامون الرشید کے انتقال کے بعد معتصم باللہ اور واثق باللہ یکے بعد دیگرے تختِ خلافت پر بیٹھے۔ امام علی النقی علیہ السّلام نے واثق کے دَورِ حکومت کے ابتدائی پانچ سال امن و سکون سے گزارے۔ واثق کے بعد متوکّل تخت نشین ہوا۔ امورِ سلطنت میں منہمک رہنے کے باعث اُس نے تقریباً چار سال تک امام علیہ السّلام اور آپ کے پیروؤں سے کوئی تعرّض نہ کیا لیکن جونہی کاروبارِ حکومت میں سلجھاؤ پیدا ہوا اُس نے امامِ عالی مقام کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ آپ ان دِنوں مدینہ میں قیام پذیر تھے اور لوگوں کی رشد و ہدایت آپ کا واحد مشغلہ تھا۔ جہاں آپ کی عالی شخصیّت اور پاکیزہ تعلیمات نے لوگوں کے دلوں میں آپ کا وقار بلند کیا وہاں یہی خوبیاں متوکّل کے حسد اور بغض و عناد کا موجب بن گئیں۔

مدینہ کے گورنر نے متوکّل کو اطّلاع دی کہ امام علیہ السّلام حکومت کا تختہ اُلٹنے کی فکر میں ہیں اور مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نے آپ کی اعانت

کی حامی بھر لی ہے۔ متوکل کو یہ اطلاع ملنے پر بہت طیش آیا لیکن اس نے ایک شاطرانہ چال چلی اور آپ کی گرفتاری کا حکم صادر نہیں کیا۔ اس کے برعکس اُس نے بظاہر تعظیم و تکریم اور محبت کا اظہار کرتے ہوئے ملاقات کے لیے دارالحکومت بلا بھیجا لیکن جب آپ وہاں تشریف لے گئے تو آپ کو عمر بھر کے لیے محبوس کر دیا۔

امام حسن العسکری علیہ السّلام

امام حسن علیہ السّلام کی ولادتِ باسعادت ۸ ربیع الثانی ۲۳۲ھ ہجری کو مدینہ منوّرہ میں ہوئی۔ آپ 'العسکری' کے لقب سے ملقب ہیں۔

امام حسن العسکری علیہ السّلام نے اپنی عمر کے بائیس سال اپنے والدِ بزرگوار حضرت امام علی النقی علیہ السّلام کے زیرِ تربیت گزارے اور ان کی شہادت کے بعد منصبِ امامت پر فائز ہوئے۔

آپ کے عہد میں عبّاسی حکمران سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف تھے تاہم وہ لوگ امامِ ربّانی حضرت حسن العسکری سے بےحد خائف تھے کیونکہ انھیں عِلم تھا کہ آپ کے فرزندِ ارجمند حضرت امام مہدی علیہ السّلام ہی بارھویں اور آخری امام ہوں گے جن کی امامت تا قیامت جاری و ساری رہے گی لہٰذا ان حکّام نے امامِ عالی مقام پر لاتعداد مظالم توڑے۔ آپ پر بے حد پابندیاں عائد کیں اور آپ کی عمر کا بیشتر حصّہ قید خانے میں گزرا۔ اس کے باوجود آپ نے امامت کی ذمّے داریاں بڑی خوشدِلی اور صبر و تحمّل سے ادا کیں۔

امام حسن العسکری علیہ السّلام ہمیشہ دینِ اسلام کی ترویج اور

لوگوں کی رشد و ہدایت میں مشغول رہے۔ تاریخِ اسلام کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ بیشتر مفسّرین نے قرآنِ مجید کے مطالب آپ کے حوالے ہی سے بیان کیے ہیں۔

عبّاسی فرمانروا المعتمد نے جب دیکھا کہ چہار سُو امام حسن العسکری علیہ السّلام کی خوش اخلاقی، کریم النّفسی اور علم وفضل کا ڈنکا بج رہا ہے تو اُسے فکر دامنگیر ہوئی کہ لوگ کہیں کھلّم کھلّا آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے آپ کو خلیفہ تسلیم نہ کرلیں چنانچہ اس خطرے کے سدِّباب کے طور پر اُس نے آپ کو شہید کرا دیا۔

امام محمّد المہدی علیہ السّلام

اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور آخری امام حضرت محمّد المہدی علیہ السّلام کی ولادتوں کے حالات و واقعات میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس طرح رسولِ اکرمؐ کی ولادت کی خوشخبری سابقہ انبیائے کرامؑ نے بہت پہلے سُنادی تھی اسی طرح امام المہدی علیہ السّلام کی پیدائش کی پیش گوئی نبیِّ کریمؐ نے فرمادی تھی۔

اس سلسلے میں لاتعداد روایات، مسانید، صحاح اور اخبار کی کتابوں اور شیعہ علماء کی تصانیف میں نقل کی گئی ہیں اور ان کی ابتدا خود رسولِ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی سے ہوتی ہے۔ بہت سے سُنّی علماء نے ان روایات کو مکمّل جلدوں میں جمع کیا ہے۔ ان میں سے "البیان فی اخبارِ صاحبِ الزمان" مؤلّفہ حافظ محمّد ابنِ یوسف شافعی، "صحاحِ ابوداؤد" اور "سنن ابنِ ماجہ" بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام کتابوں میں ایسی

روایات درج ہیں جن سے اس امامِ عالی مقام کی آمد کی شہادت ملتی ہے۔
آپ ۱۵ ؍شعبان ۲۵۵ھ ہجری کو سامرہ کے شہر میں پیدا ہوئے۔ جن غیر معمولی حالات میں آپ کی ولادتِ باسعادت وقوع پذیر ہوئی وہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی ولادت کے حالات سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی ولادت اُس ظالم فرعون کی سلطنت کی بربادی کا پیش خیمہ تھی جس نے حکم دے رکھّا تھا کہ بنی اسرائیل کے تمام نرینہ فرزند پیدا ہوتے ہی قتل کر دیے جائیں۔ اسی طرح امام مہدیؑ کی ولادت کے بارے میں رسولِ اکرمؐ کی متعدّد احادیث کے پیشِ نظر عبّاسی حکمران بھی بیحد خائف تھے کیونکہ انھیں علم تھا کہ آپ کی دنیا میں تشریف آوری ان کی سلطنت کے لیے سقوط اور تباہی کی علامت ہوگی۔ چنانچہ وہ اس تاک میں تھے کہ جونہی آپ کی ولادت کا علم ہو آپ کو ختم کر دیں لیکن آپ کی پیدائش کو حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کی طرح قدرتِ خداوندی نے معجزانہ طور پر مخفی رکھّا اور آپ کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھّا۔ آپ کی ولادت اور پرورش گاہ کے بارے میں چند راسخ العقیدہ مومنین کے علاوہ کسی کو علم نہ ہوسکا۔
جب امام علیہ السّلام کی والدہ ماجدہ کو المعتمد کے سامنے پیش کیا گیا اور اس نے بارھویں امامؑ کی ولادت کے بارے میں دریافت کیا تو ان محترمہ نے اپنی اور اپنے بچّے کی جان بچانے کے لیے جواب دیا کہ میں نے زچگی اور دردِ وضعِ حمل کے آثار کبھی محسوس نہیں کیے۔ یہ جواب سُن کر وقتی طور پر تو المعتمد انھیں پریشان کرنے سے باز رہا لیکن اس نے قاضی ابوشوراب کو ان پر کڑی نگرانی رکھنے کا حکم دیا اور اسے یہ ذمّے داری بھی سونپی کہ جونہی وہ بچّے کو جنم دیں اس نومولود کو قتل کر دیا جائے۔

اِس واقعہ کے بعد جلد ہی عباسی حکومت ایک ایسے انقلابی مرحلے سے گزری جس نے المعتمد کو پریشان کر دیا۔ اسے صاحب الزنج کے حملے کا سامنا کرنا پڑا جس نے حجاز اور یمن پر چڑھائی کی اور عبّاسی حکومت کے اطراف واکناف میں لُوٹ مار کا بازار گرم کر دیا جس کے نتیجے میں دارالحکومت بغداد میں افراتفری پھیل گئی۔ ان حالات میں المعتمد کو امام عالی مقامؑ کی والدہ ماجدہ کی جانب توجہ دینے کی فرصت ہی نہ ملی۔ چنانچہ چھ ماہ بعد انھیں رہا کر دیا گیا اور پھر بارھویں امامؑ کی ولادت کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہ کی گئی۔

امام محمّد المہدیؑ کی پرورش کے سلسلے میں آپ کے والدِ بزرگوار امام حسن العسکری علیہ السّلام نے ویسی ہی رازداری برتی جیسی حضرت ابوطالبؑ رسولِ اکرمؐ کی حفاظت کے سلسلے میں برتتے تھے۔ آپ اپنے بچّے کو چند دن گھر کے ایک حصّے میں رکھتے اور پھر دوسرے حصّے میں منتقل کر دیتے تاکہ کسی کو ان کی پرورش گاہ کا پتا نہ چل سکے۔

گو امام حسن العسکری علیہ السّلام نے اپنے بچّے کی ولادت اور اس کے بچپن کے حالات و واقعات کو صیغۂ راز میں رکھّا تاہم آپ نے اُسے اپنے چند خاص اور مخلص دوستوں سے متعارف بھی کرایا تاکہ انھیں اپنے آئندہ امام کا علم ہو جائے اور وہ اس کے دستِ حق پرست پر بیعت کر سکیں۔ چنانچہ سُنّی اور شیعہ دونوں فرقوں کی مستند کتابوں میں چند ایسے اشخاص کے نام درج ہیں جنھیں بارھویں امامؑ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

جب امام حسن العسکری علیہ السّلام کے فرزندِ ارجمند تولّد ہوئے تو انھوں نے اُن کا نام محمّدؑ رکھّا اور ان کی ولادت کے تیسرے دن انھیں اپنے چند پیروؤں کے روبرو لا کر یوں ارشاد فرمایا:

"یہ ہے میرا جانشین اور تمھارا آئندہ امام! یہ وہی قائم
ہے جس کے آگے تمھارے سر ادب سے جُھک جائیں گے۔
جب دنیا گناہوں اور برائیوں کی آماجگاہ بنی ہوگی تو یہ دوبارہ
ظاہر ہو کر اسے برکتوں اور انصاف سے معمور کر دے گا۔"
معاویہ ابنِ حکیم، مواہ محمّد ابنِ ایوب اور محمّد ابنِ عثمان کے بیان کے
مطابق وہ چالیس افراد کے ایک وفد کے ہمراہ امام حسن العسکریؑ کی خدمت
میں حاضر ہوئے۔ امام عالی مقامؑ نے انھیں اپنا نومولود فرزند دکھایا اور فرمایا:
"میرے بعد یہ تمھارا امام ہے۔ تم سب پر لازم ہے کہ بلا استثنا
اس کی بیعت کرو اور اس سلسلے میں کوئی تنازعہ کھڑا نہ کرو کیونکہ
اگر تم ایسا کرو گے تو اپنے آپ کو خطرے میں ڈال لو گے۔ یہ بھی
یاد رکھو کہ آئندہ تم اسے نہ دیکھ سکو گے۔"
امام حسن العسکری علیہ السّلام نے ۸ ربیع الاوّل ۲۶۰ھ ہجری میں
انتقال فرمایا اور اسی دن سے اُن کے گرامی قدر فرزند کی امامت کی ابتدا
ہوئی جو ساری دنیا کے لیے روحانی ہدایت کا موجب ہے۔ چونکہ مشیّتِ الٰہی
کے مطابق امامِ عالی مقام کے تمام معاملات پسِ پردہ طے پانے تھے اِس
لیے آپ نے چند ایسے اشخاص کو جو آپ کے والد بزرگوار کے زمانے سے
مذہبی امور کی دیکھ بھال کر رہے تھے، اپنے نائبین اور سفراء مقرّر کیا تاکہ وہ
عامّۃ الناس اور پسِ پردہ امام کے مابین رابطہ رکھّیں۔ وہ لوگوں کی عرضداشتیں
اور مسائل امامؑ کے سامنے پیش کرتے تھے اور آپ جو احکام اور جوابات
دیتے وہ لوگوں تک پہنچاتے تھے۔
آپ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے غائب ہوئے اور رضائے الٰہی کے مطابق

ہی دوبارہ ظاہر ہوں گے۔ آپ کی تشریف آوری یوم قیامت کی تمہید ہوگی۔

امام علیہ السلام کی غیبت کے زمانے میں ہمارا فرض ہے کہ ہم آپ کے ظہور کے منتظر رہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ قرآنی احکام اور تعلیمات پر مبنی معاشرتی ترقی کا ایک معقول اور مدبّرانہ نظام ترتیب دیں اور اسے دنیا کے سامنے پیش کریں۔ ہمیں یہ بھی چاہیئے کہ قوانینِ خداوندی کی برتری اور تاثیر لوگوں پر ثابت کریں اور ان کی توجّہ نظامِ ربّانی کی جانب مبذول کرائیں۔ ہمیں اوہام پرستی اور باطل اعتقادات کے خلاف جہاد کرنا چاہیئے اور اسلام کی آفاقی حکومت کے قیام کی راہ ہموار کرنی چاہیئے۔ ہمارے لیے لازم ہے کہ قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں دنیا کے مسائل حل کرنے کے لیے ایک لائحۂ عمل تیّار کریں اور اسے دنیا کے مصلحین کے سپرد کر دیں تاکہ وہ اس سے استفادہ کریں۔ ہمارا فرض ہے کہ اہلِ عالَم کے خیالات کو جِلا بخشیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے آپ کو امام علیہ السلام کے ظہور اور انصاف پر مبنی عالمی حکومت کے قیام کے لیے آمادہ کریں۔

اہل البیتِ رسولؐ کے پیرو

جن لوگوں کا یہ ایمان ہے کہ امام علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام، رسولِ اکرمؐ کے بلافصل خلیفہ اور جانشین تھے وہ شیعہ (پیرو) کہلاتے ہیں شیعہ، امام علی علیہ السلام اور ان کے گیارہ معصوم اخلاف کو اپنا پیشوا اور امام مانتے ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ سچّا شیعہ وہ ہے جو امام علی علیہ السلام اور دوسرے ائمۂ طاہرین کے نقشِ قدم پر چلے اور انھیں ہر عیب اور گناہ سے منزّہ سمجھے۔

امام محمّد باقر علیہ السّلام نے جناب جابر ابنِ عبداللہ انصاری رض سے فرمایا:

"اے جابر! کیا ایک شخص کے شیعہ ہونے کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ وہ خانوادۂ رسول ص کا مؤیّد ہونے کا دعویدار ہو؟ بخدا ہمارا مؤیّد صرف وہ شخص ہے جو متّقی ہو اور اللہ کے احکام مانے۔ پہلے ہمارے مؤیّدین (شیعہ) کی پہچان یہ تھی کہ وہ حلیم الطبع اور راستباز ہوتے تھے۔ اللہ کو یاد کرتے تھے۔ روزے رکھتے تھے۔ نمازیں پڑھتے تھے۔ ماں باپ سے اچّھا سلوک کرتے تھے اور ہمسایوں، محتاجوں، قرضداروں اور یتیموں کی مدد کرتے تھے۔ وہ اپنی صداقت اور قرائتِ قرآن کی وجہ سے معروف تھے وہ کبھی کسی کے بارے میں بدگوئی نہیں کرتے تھے۔ ان پر سبھی اعتماد کرتے تھے۔"

جابر رض نے جواب دیا: "یا ابنِ رسول اللہ ص! میں فی زمانہ کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس میں یہ تمام خوبیاں جمع ہوں۔"

اس پر امام علیہ السّلام نے فرمایا: "اے جابر! مختلف اعتقادات کی وجہ سے غلط فہمی میں مت مبتلا ہو۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ ایک شخص کی نجات کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اللہ کے احکام کی پیروی کیے بغیر علی علیہ السّلام کا مؤیّد ہونے کا دعویدار ہو؟ اگر کوئی شخص کہے کہ وہ رسول اکرم ص کا مؤیّد ہے لیکن ان کی تعلیمات پر عمل نہ کرے تو وہ نجات کا حقدار نہ ہوگا حالانکہ آنحضرت ص کا مرتبہ امام علی علیہ السّلام سے بلندتر ہے۔ اہلِ تشیّع کا فرض یہ ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور اس کے احکام کے مطابق عمل کریں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی کسی سے رشتے داری نہیں۔ وہ فقط ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو پرہیزگار ہوں اور اس کے احکام مانیں۔ واللہ! اللہ کا قرب

حاصل کرنے کا اس کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں کہ اس کے ارشادات کی تعمیل کی جائے۔ ہم دوزخ سے نجات کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ جو اللہ کے احکام مانے وہ ہمارا دوست ہے اور جو اس کی نافرمانی کرے وہ ہمارا دشمن ہے۔ کوئی شخص تقویٰ اور نیک اعمال کے بغیر ہمارا دوست نہیں بن سکتا۔"

امام جعفر الصادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے :

" پرہیزگار اور دیندار بنو۔ راستگو، دیانتدار اور شائستہ بنو۔ اپنے ہمسایوں سے اچھّا سلوک کرو۔ اپنے نیک کردار اور حسنِ سلوک کے ذریعے لوگوں کو صراطِ مستقیم کی جانب مائل کرو۔ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ہمارے لیے باعثِ رُسوائی نہ بنو۔ اپنے رکوع اور سجود کو طول دو، کیونکہ جب کوئی شخص اپنے رکوع اور سجود کو طول دیتا ہے تو شیطان بے حد برافروختہ اور پریشان ہوتا ہے اور چلّا کر کہتا ہے: "کتنی شرم کی بات ہے کہ یہ لوگ اللہ کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں جب کہ میں نے اس کی نافرمانی کی۔ وہ سجدے بجا لاتے ہیں جب کہ میں نے سجدہ کرنے سے انکار کیا۔"

ایک اور موقع پر امام جعفر الصادق علیہ السّلام نے فرمایا :

" عیسیٰ علیہ السّلام کے شاگرد ان کے شیعہ (یعنی پیرو، ہمدرد اور معاون) تھے لیکن وہ ہمارے شیعہ سے بہتر نہیں تھے۔ انھوں نے آپ سے (یعنی عیسیٰ علیہ السّلام سے) مدد کرنے کا وعدہ کیا لیکن انھوں نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور اللہ کی راہ میں جہاد سے قاصر رہے۔ اس کے برعکس ہمارے شیعہ نے رسولِ اکرمؐ کے وصال کے دن سے آج تک کبھی ہماری

معاونت سے پہلوتہی نہیں کی۔ انھوں نے ہماری خاطر ہر قربانی دی ہے۔ انھیں زندہ جلادیا گیا۔ انھیں شکنجوں میں کسا گیا۔ انھیں خانہ بدر کیا گیا لیکن انھوں نے ہماری حمایت ترک نہ کی۔

مسلمان بھائیوں کے بارے میں ہمارا اعتقاد

گو خلافت اور رسولِ اکرمؐ کی جانشینی کے بارے میں ہمارے اور اہلِ سنّت کے مابین اختلافات موجود ہیں اس کے باوجود ہم دوسرے مسلمانوں کو اپنا دینی بھائی اور ہم مذہب سمجھتے ہیں۔ ہمارا خدا ایک ہے۔ ہمارا رسولؐ ایک ہے۔ ہمارا دین ایک ہے۔ ہماری کتاب ایک ہے اور ہمارا قبلہ بھی ایک ہے۔ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے وقار اور ترقّی کو اپنا وقار اور ترقّی، ان کی کامیابی اور فتح مندی کو اپنی کامیابی اور فتح مندی اور ان کی ذلّت اور شکست کو اپنی ذلّت اور شکست گردانتے ہیں۔ ہم دُکھ اور سُکھ میں ایک دوسرے کے ساجھی ہیں۔

اس بارے میں ہم نے اپنے عظیم پیشوا امام علی علیہ السّلام سے فیضان حاصل کیا ہے۔ اگر آپ چاہتے تو خلافت پر اپنے حق کا دفاع کر سکتے تھے لیکن اسلام کے عظیم تر مفاد میں نہ صرف یہ کہ آپ نے خلفاء سے پنجہ آزمائی کرنے سے اجتناب کیا بلکہ نازک حالات میں اُن کی مدد بھی کی۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی خاطر کوئی اقدام کرنے سے آپ نے کبھی دریغ نہیں کیا۔

ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے ایک طاقتور قوم کی حیثیّت سے زندہ رہنے، اپنی دیرینہ عظمت کو دوبارہ

حاصل کرنے اور غیر قوموں کے تسلط سے چھٹکارا پانے کی فقط ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ باہمی بغض و عناد اور کدورتوں سے اپنے دلوں کو پاک کریں۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اپنی قوّت مجتمع کریں اور اسلام کی شوکت اور مسلمانوں کی ترقّی اور پیش رفت کے لیے اجتماعی اقدامات کریں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر